غلام قادر فصیح

احوال و آثار

عظمت رُباب

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

غلام قادر فصیح۔ احوال و آثار

غلام قادر فصیح

احوال و آثار

عظمت رُباب

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۸۰

نومبر ۲۰۰۷ء

نام کتاب : غلام قادر فصیح ۔ احوال و آثار

مصنف : عظمت رُباب

ناشر : مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

طابع : سیّد محمد عمران رضوی

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز، ۱۰۸۔ لٹن روڈ، لاہور

تعداد اشاعت : ۳۰۰

صفحات : ۱۵۴

قیمت : ۱۵۰ روپے

یہ کتاب محکمہ ثقافت و اطلاعات و امور نوجوانان
حکومت پنجاب کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

خریداری کے لیے

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

۷۶۔ سی، جوڈیشل کالونی۔ فیز II، رائے ونڈ روڈ، لاہور

فون برائے رابطہ : ۷۵۱۲۷۲۴

فہرست

۱۔		پیش لفظ	۷
۲۔	باب اول:	غلام قادر فصیح۔ حالاتِ زندگی	۹
۳۔	باب دوم:	غلام قادر فصیح کی تصانیف کا جائزہ	۴۵
۴۔	باب سوم:	موتیوں کا جزیرہ۔ تجزیاتی مطالعہ	۱۱۵
۵۔		کتابیات	۱۵۱

حافظ قائم الدینؒ عرف ولی اللہ
حافظ عبداللہؒ
حافظ احمد علی
مولوی محمد علی
الحاج میاں غلام علیؒ
منشی غلام قادر فصیحؒ
میاں غلام حسن
میاں غلام حیدر
غلام مرتضیٰ
حسن بی بی
میاں امیر علی
میاں انعام علی
حکیم اکرام علی
ڈاکٹر ریاض قدیر
پروفیسر ظفر اقبالؒ
مریم
بیگم زبیدہ بیگم دختر میاں غلام علیؒ
انجنیئر وحید اقبال
ثمر اقبال
سلیم اقبال
رفعت اقبال
سعیدہ اقبال
عفت اقبال
سعدیہ اقبال
جرأت اقبال
طلعت اقبال
انجنیئر عرفان اقبال
ڈاکٹر عمران وحید
رضوان وحید
حافظ زبیر الرحمن
عروبہ سعید قریشی
الحاج میاں غلام علیؒ
زبیدہ بیگم
میاں مظفر علی
میاں فیض علی
میاں برکت علی
میاں رحمت علی
جنت بی بی
زینب بی بی
سکینہ بی بی
فاطمہ بی بی
اشرف علی
نیروز بخت
صفدرا فیروز بخت
محمد نیر بخت
رمضان بی بی
علی محمد
بھولاں بی بی
(والدہ پروفیسر ظفر اقبال)
سہاگاں بی بی
جنت بی بی
حیات بی بی
منشی نور محمد
خواجہ محمد یوسف
خواجہ عبداللہ
خواجہ عبدالحکیم
زینب
کلثوم
فاطمہ
خواجہ عبدالحمید
خواجہ محمد سعید
خواجہ محمد تسنیم وغیرہ

پیش لفظ

لاہور علم وادب کا اہم مرکز ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں بیسویں صدی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ لاہور میں اردو کی داغ بیل ڈالنے اور اس کو فروغ دینے والوں میں اردو ادب کی عظیم شخصیات شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''انجمن پنجاب'' کے حوالے سے جدید نظم کی بنیاد رکھی۔ شیخ عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' کے اجراء سے اردو ادب میں مغربی اثرات، تراجم اور خاص کر رومانوی تحریک نے فروغ پایا۔ تحقیق وتدوین مین مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، حمید احمد خاں اور غلام رسول مہر کے نام نمایاں ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جن لوگوں نے لاہور اور پنجاب میں اردو زبان وادب، صحافت اور تراجم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان میں غلام قادر فصیح (۱۸۶۰ء۔۱۹۱۲ء) کا نام بھی شامل ہے۔

امتدادِ زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں سے بہت سے نام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ محققین اور ادب شناسوں نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے ان ادیبوں کو اصل مقام دلانے کی کوشش کی جو گردشِ زمانہ کی وجہ سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لاہور سے وابستہ علماء، شعراء، فنکاروں، محققین، صحافیوں اور مترجمین کو ادب میں روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کے لیے میری توجہ غلام قادر فصیح اور ان کی خدمات کی طرف مبذول کرائی۔ ڈاکٹر محمد خان اشرف کی نگرانی میں مَیں نے اس موضوع کے لیے مواد جمع کرنا شروع کیا۔ بعدازاں حالات کی تبدیلی اور یونیورسٹی قوانین کی وجہ سے مجھے اپنا موضوع تبدیل کرنا پڑا تاہم اس دوران میں میں نے بہت سا بنیادی کام کر لیا تھا۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کمال مہربانی سے ہدایت کی کہ اس بنیادی کام کو کتابی صورت میں مرتب کردوں تاکہ اردو خواں طبقے کو دبستانِ لاہور کی گمنام شخصیت غلام قادر فصیح سے متعارف کرایا جا سکے۔

غلام قادر فصیح اپنے عہد کی نمایاں شخصیت ہیں۔ وہ ایک وضع دار، متاثر کن اور ہمہ کوش کردار کے مالک تھے۔ سیالکوٹ میں ''پنجاب پریس'' کے نام سے ان کا اپنا پریس تھا۔ اس پریس سے انہوں نے اپنی بہت سی کتب شائع کیں۔ انہوں نے اپنے دور کے مقبول ترین تراجم کیے۔ ''دربار لندن کے اسرار''، ''موتیوں کا جزیرہ'' اور ''عمر پاشا'' اپنے عہد کے مقبول ترین تراجم تھے جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ فصیح نے چار جلدوں میں ''تاریخ اسلام'' شائع کی جس کے چار ایڈیشن سامنے آئے۔ صحافت کی دنیا میں بھی فصیح کا نام ہفتہ وار ''پنجاب گزٹ''، ماہوار رسالہ ''ناولسٹ''، ماہوار ''پنجاب جرنل'' اور ''ماہوار ''الحق'' کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی ترجمے کے ساتھ قرآن پاک کی اشاعت کا کام بھی کیا۔ غلام قادر فصیح کی تصنیفات و تالیفات کی کل تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق ۵۴ ہے۔ لاہور میں اسلامیہ پارک کی ایک سڑک ''فصیح روڈ'' ان کے نام سے منسوب ہے۔ اپنی زندگی میں وہ مشہور اور نامور شخصیات میں شامل تھے۔ ایسی شخصیت جس نے ادب و صحافت کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

بے ترتیب مواد سے کتابی صورت تک کا سفر ڈاکٹر محمد خان اشرف کی راہ نمائی میں مکمل ہوا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مجھے کام کرنے کی ترغیب دی بلکہ ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور طالب علم ان کی راہنمائی میں آگے بڑھتے رہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اردو تحقیق و تدوین کا روشن مینار ہیں۔ طالب علموں اور اساتذہ کو ان کی رہنمائی کا میسر ہونا ایک اعزاز ہے۔ انہوں نے کمال مہربانی و عنایت سے میری راہنمائی کی۔ بنیادی مآخذات کی جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ اپنی علالت کے باوجود مسودے کا مطالعہ کیا اور اس کی تصحیح کی۔ ان کی شفقت سے یہ تحقیقی مطالعہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

عظمت رباب

باب اول

غلام قادر فصیح۔ حالاتِ زندگی

(۱۸۶۰ء۔۱۹۱۲ء)

سیالکوٹ علمی وادبی اور سیاسی وصنعتی حوالے سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ مولوی میر حسن ۱۸۴۴ء۔۱۹۲۹ء)، علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء)، آغا صفدر، غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵ء۔۱۹۰۸ء)، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، حکیم نورالدین (۱۸۴۱ء۔۱۹۱۴ء)، مولوی محمد ابراہیم (۱۸۷۴ء۔۱۹۵۶ء) اور دیگر بہت سی نامور شخصیات نے اپنی انفرادی صلاحیتوں سے سیالکوٹ کو ایک مردم خیز شہر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔(۱)،(۲)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چند بڑے نامور ادیبوں میں ایسے نام گوشہ گمنامی میں مستور ہو جاتے ہیں جو بذاتِ خود اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں لیکن میرِ کارواں کے نمایاں ہونے کی وجہ سے اُن پر توجہ مرکوز نہیں کی جاتی۔ اردو ادب، صحافت اور سیاست کی ایسی ہی ایک شخصیت منشی غلام قادر فصیح کی ہے۔

آباء واجداد:

منشی غلام قادر فصیح کشمیر کے ایک مشہور قریشی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا حافظ قائم الدین عرف ولی اللہ عین زمانۂ شباب میں اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ وطن کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آ گئے۔ ان دونوں بہن بھائی کی سیالکوٹ آمد کے ثمرات کے بارے میں محترمہ سعیدہ احسن کا کہنا ہے:

> ''علم و آگہی کی جو شمع یہ دونوں بہن بھائی کشمیر سے لے
> کر آئے تھے آج تک اس خاندان میں روشن ہے اور اپنے

آباء واجداد کا نام روشن کر رہی ہے۔" (۳)

جن دنوں حافظ قائم الدین اور ان کی ہمشیرہ ہجرت کر کے آئے ان دنوں کشمیر میں مذہبی تحریک زوروں پر تھی۔ مہاراجا گلاب سنگھ کا عہد تھا۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے۔ بہت سے خاندان جان وایمان بچانے کی خاطر کشمیر چھوڑ کر پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد ہو رہے تھے۔ چنانچہ حافظ قائم الدین بھی سیالکوٹ شہر کے محلہ میانہ پورہ میں فروکش ہو گئے۔ (۴)

روایت مشہور ہے کہ جب حافظ صاحب اپنے میزبان (نور محمد) کے ہاں اترے تو صاحب خانہ نے آپ کو ایک کٹورے میں آب خنک پیش کیا۔ حافظ صاحب نے پانی پینے سے معذرت کی۔ حافظ صاحب ان دنوں بصارت سے محروم ہو چکے تھے۔ میزبان نے اصرار کیا لیکن حافظ صاحب نے یہ کہہ کر پھر انکار کر دیا اور فرمایا کہ کٹورے میں دراڑ ہے۔ میزبان کو کوئی دراڑ نظر نہ آئی۔ چنانچہ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ حافظ صاحب آپ کو تو نظر نہیں آتا آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ کٹورے میں دراڑ ہے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ کٹورے کو کچھ دیر کے لیے زمین پر پڑا رہنے دو اگر پانی کی کوئی بوند کٹورے کے باہر آ گئی تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہے۔ چنانچہ صاحب خانہ نے ایسا ہی کیا۔ کہتے ہیں کہ چند لمحوں کے بعد ایک بوند کٹورے کے باہر دیکھی گئی۔ حافظ صاحب سے کچھ اور بھی کرامات کا ظہور ہوا جن کی وجہ سے آپ کا نام ولی اللہ مشہور ہو گیا۔

ایک روایت کے مطابق صاحب خانہ (نور محمد صاحب) حافظ صاحب کے رشتے دار تھے۔ حافظ صاحب کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کی ہمشیرہ کا نکاح محلہ میانہ پورہ کے ایک کشمیری خاندان میں ہو گیا۔ حافظ صاحب تازیست سلسلہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ (۵)

حافظ قائم الدین کو اللہ تعالیٰ نے آخری عمر میں ایک فرزند عطا کیا جس کا نام انہوں نے عبداللہ رکھا۔ ان کا یہ بیٹا ابھی دو سال ہی کا تھا کہ حافظ قائم الدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حافظ صاحب کی تربت ملا عبدالحکیم کے مقبرے کے پاس بنائی گئی۔ حافظ صاحب کی بیوہ ابھی جوان تھیں اس لیے ان کا دوسرا عقد جامکے (تحصیل وضلع) سیالکوٹ میں ہو گیا۔ عبداللہ صاحب کچھ عرصہ

جامکے میں رہے اس کے بعد سیالکوٹ آ گئے ۔ یہاں پر قرآن حکیم پڑھا اور سیالکوٹی کاغذ بنانے کا کام سیکھا۔ اساتذہ سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔(۶)

حافظ عبداللہ کے صاحبزادے نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ حافظ عبداللہ اپنے صاحبزادے کو اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور پوتے کے حافظ قرآن ہونے پر مبارک عرض کی تو حافظ عبداللہ کی والدہ نے فرمایا یہ مبارک باد تو بیٹا تمہاری بیوی کو ملنی چاہیے جو قیامت کے روز اپنے بیٹے کے اس کارِ خیر کی وجہ سے پردے میں اٹھے گی۔ حافظ صاحب نے اسی وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ قرآن مجید ضرور حفظ کروں گا تا کہ میری والدہ بھی قیامت کے دن پردے میں اٹھنے کی سعادت حاصل کر سکیں ۔ چنانچہ ایک ہی سال میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔(۷)

حافظ عبداللہ دراز قد، چوڑے چکلے، خوش شکل اور خوش خصال بزرگ تھے۔ سرخ و سپید رنگت کے مالک اور چہرے سے نور برستا تھا۔ سنجیدگی اور متانت کے پتلے، متقی اور ہر ہیز گار انسان تھے۔ خدا کی مخلوق کے غم گسار اور ہمدرد تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب پہلی بار پیدل حج کے لیے تشریف لے گئے تو اول مدینے شریف حاضری کی۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے وقت راستے میں قافلہ لٹ گیا لیکن حافظ صاحب لٹیروں کی دست برد سے بچ گئے۔ ان کے قافلے کا ایک آدمی زخموں کی وجہ سے نڈھال زمین پر پڑا تھا۔ حافظ عبداللہ نے اس کے زخم دھوئے، مرہم پٹی کی اور دور تک کندھوں پر اٹھائے چلتے رہے۔ راستے میں سواری کا انتظام ہو گیا تو اس آدمی کو سفر کی سہولتیں بھی مہیا کر دیں۔ واپسی پر جہاز میں بھی ہمراہ تھے۔ جہاز بمبئی پہنچا تو اس آدمی کے خویش و اقارب بندرگاہ پر موجود تھے۔ اس آدمی نے اپنے رشتہ داروں کو سب حال کہہ سنایا۔ وہ عبداللہ صاحب کو اپنے گھر لے گئے اور بہت خاطر تواضع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ زخمی حاجی ایک مشہور سیٹھ تھا۔ حافظ عبداللہ نے اس آدمی کی تیمارداری کے دوران میں کبھی دریافت ہی نہ کیا کہ وہ شخص کون ہے اور اس کا کیا کاروبار ہے۔ اس کے بعد حافظ عبداللہ نے تین اور حج کیے۔ حج کو جاتے ہوئے ہمیشہ سیٹھ صاحب کے ہاں ٹھہرا کرتے۔ آخری بار حج کے لیے بمبئی پہنچ چکے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ سیٹھ صاحب نے مولوی محمد علی کو تار دے کر بلوایا اور انہیں یہیں سے واپس آنا پڑا۔(۸)

حافظ عبداللہ کے پوتے سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی منگنی کا بندوبست

ایک سید خاندان میں کیا۔ جب حافظ عبداللہ سے اس سلسلے میں بات چیت کی گئی اور ان کی رضامندی دریافت کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر منع فرمادیا کہ سادات کے احترام کی وجہ سے سید زادی کو گھر میں نہیں لانا چاہیے۔ میاں بیوی میں بعض اوقات تلخ کلامی بھی ہو جاتی ہے اور اس سے اہل سادات کے احترام میں خلل واقع ہونے کا امکان ہوتا ہے۔(۹)

حافظ صاحب سے ان کے پوتے نے پوچھا باباجی! آپ روزانہ کتنا قرآن مجید ختم کرتے ہیں تو فرمایا کہ بیٹا جوانی میں روزانہ ایک پورا قرآن مجید ختم کیا کرتا تھا اب پندرہ پارے تلاوت کرتا ہوں۔(۱۰)

حافظ صاحب نے اپنے ہاتھ سے قرآن پاک کی کتابت کی، اس کے لیے کاغذ اور روشنائی خود بنانے کا اہتمام کیا، قلم بھی خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتے تھے۔ ایک قرآن مجید انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے لیے کتابت کیا۔ حافظ عبداللہ اور ان کی بیوی اسی قرآن پاک سے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ یہ نسخہ پہلے حافظ عبداللہ کے پوتے حاجی امیر علی کے پاس تھا لیکن آج کل یہ غلام قادر فصیح (حافظ عبداللہ کے بیٹے) کے پوتے ڈاکٹر سعید اقبال کے پاس موجود و محفوظ ہے۔

تین بیٹوں حافظ احمد علی، مولوی محمد علی اور میاں غلام حسن کی وفات کے بعد حافظ صاحب زیادہ کمزور ہو گئے اور بصارت بھی جاتی رہی۔ وہ اپنے دوسرے بیٹوں میاں غلام علی اور غلام قادر فصیح کے پاس محلہ کشمیری کمہاراں میں تشریف لے گئے اور کم و بیش چار ماہ بیمار رہ کر انتقال کیا۔ ان کو شہر کے مشرق میں واقع مقبرہ بابر شہید کے قبرستان میں اپنے بیٹے مولوی محمد علی کی قبر سے متصل دفن کیا گیا۔(۱۱)

حافظ عبداللہ کی اولاد:

۱۔ حافظ احمد علی

یہ سیالکوٹ شہر کے جید حافظ تھے۔

۲۔ مولوی محمد علی

امریکن مشن ہائی سکول سیالکوٹ شہر میں اوری اینٹل ٹیچر تھے اور مشن کی عمارتوں کی تعمیر و مرمت کا ٹھیکہ لیتے تھے۔

۳۔ الحاج میاں غلام علی

مالی لحاظ سے بہت مضبوط تھے۔ اپنے بھائی فصیح سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ فصیح کے بڑے بیٹے مولوی ظفر اقبال کے سسر تھے۔

۴۔ منشی غلام قادر فصیح

بہن بھائیوں میں چوتھا نمبر تھا۔ علم وادب سے شغف و دلچسپی تھی۔

۵۔ غلام حیدر

امامت کرتے تھے۔

۶۔ غلام حسن

اپنے سب بھائیوں میں دلکش شکل وصورت کے مالک تھے۔ جب کبھی بازار میں سے گھوڑے پر یا پیدل گزرتے تھے لوگ کاروبار چھوڑ کر دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی شادی مولوی ابراہیم میر کی ہمشیرہ مہر بی بی سے ہوئی تھی۔

۷۔ غلام مرتضیٰ اور حسن بی بی

یہ نوجوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

غلام قادر فصیح تین بھائیوں احمد علی، محمد علی اور غلام علی کے بعد ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن حافظ صاحب اور بڑے بھائیوں کے سایۂ عاطفت میں گزارا۔ لڑکپن ہی سے ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ امریکن مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کیا۔ بڑے بھائی مولوی محمد علی اسی ہائی سکول میں ہیڈ اوری اینٹل ٹیچر تھے۔

ان کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا۔ اس خطے کے لوگ اپنی سرخ وسپید رنگت، خاندانی پس منظر و مناسبت سے اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ ''غلام قادر فصیح کی رنگت بھی سرخ وسپید تھی، قد تقریباً ساڑھے سات فٹ تھا، آنکھیں بڑی بڑی جن میں سرخ ڈورے نمایاں تھے۔ عہد شباب میں بدن چھریرا تھا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ موٹاپا بڑھتا گیا اور وہ فربہ ہو گئے۔ سینہ فراخ، شانے بھرے بھرے تھے، ان کی جامہ زیبی مشہور تھی، ناک ستواں اور ہونٹ پتلے۔ بڑے بوڑھے انہیں سیالکوٹ کا شہزادہ کہا کرتے تھے۔'' (۱۲)

غلام قادر فصیح کا لباس سادہ ہوتا تھا مگر ڈھنگ سے سلا ہوا ہوتا تھا۔ لٹھے کا پاجامہ اور

لٹھے ہی کی قمیض زیب تن کرتے۔ سوائے عاشورے کے باقی ایام میں ٹوپی، جو اکثر شرفا کا پہناوا تھا ، پہنتے تھے۔ جوتا ہمیشہ دساکھی موچی سے بنوا کر پہنتے۔ کوٹ موسم کے مطابق پہنتے تھے۔ واسکٹ کا استعمال کم کرتے تھے۔ (۱۳)

گھوڑے کی سواری کے شوقین تھے۔ یوم عاشورہ کو تعزیہ کی روانگی کی ترتیب مقرر کرنے کے لیے جج مقرر ہوا کرتے۔ اس دن خاص طور پر لنگی اور کلاہ کا استعمال کرتے اور جلوس کا انتظام کرتے تھے۔ عاشورے کے روز سوائے سفید رنگ کے گھوڑے کے، سواری نہ کرتے۔ یہ ان کی میونسپل کمشنری کا زمانہ تھا۔ (۱۴)

فصیح صاحب رات کے وقت شمع کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ کیروسین آئل کی روشنی کے مخالف تھے اور اس کو آنکھوں کے لیے مضر قرار دیتے تھے۔ بچوں کے لیے ایک مکتب بھی کھول رکھا تھا جس میں سید مراد شاہ کے علاوہ خود بھی تعلیم دیا کرتے۔ فصیح صاحب کے یہی رفیق کار پنجاب پریس کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ (۱۵)

غلام قادر فصیح ۲۹ سال میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے۔ بعد میں وائس پریزیڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ ان دنوں انگریز ڈپٹی کمشنر اپنے اپنے ضلع کی کمیٹی کا پریزیڈنٹ ہوا کرتا تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے کئی دفعہ ہاؤس ٹیکس لگانے کے لیے زور دیا لیکن فصیح صاحب نے اس کی چلنے نہ دی۔ فصیح صاحب ہی کی تجویز سے کمیٹی نے شاہ دولہ پل کے دوسری طرف کی زمین نیلام کی جو فصیح صاحب کے بڑے بھائی میاں غلام علی نے خرید لی اور وہاں اینٹوں کا آوا اور بھٹہ لگایا۔ بعد ازاں میاں غلام علی نے اس زمین پر مسجد، سرائے اور بہت سی دوسری عمارات تعمیر کرائیں۔ (۱۶)

غلام قادر فصیح نے سیالکوٹ سے ایک ہفتہ وار اردو رسالہ ''پنجاب گزٹ'' بھی نکالا۔ اس رسالے کی اشاعت جموں اور کشمیر میں زیادہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں اس کی اشاعت تقریباً ۲۵۰ تھی۔ رسالے کی تحریروں کی وجہ سے شیخ میراں بخش جو ریاست کے وزیر تھے اور خیانت کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے، رہا ہوئے۔ (۱۷)

''پنجاب گزٹ'' کے اجرا کے حوالے سے ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

> ''۱۸۹۸ء میں منشی غلام قادر نے پنجاب گزٹ جاری کیا۔ یہ تحریک آزادی کا حامی تھا۔'' (۱۸)

امداد صابری نے پانچ جلدوں میں تاریخ صحافت لکھی۔ جلد سوم میں پنجاب گزٹ کے حوالے سے درج ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

> ''سیالکوٹ سے یہ ہفتہ وار پرچہ ۱۸۸۹ء میں نکلا۔ یک شنبہ کو آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹر منشی غلام قادر فصیح تھے۔ سالانہ چندہ دو روپیہ تھا۔ پنجاب پریس میں چھپتا تھا۔''(۱۹)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ''کتابیاتِ پاکستان اور اخبارات اور رسائل'' میں فصیح کے زیر ادارت شائع ہونے والے دیگر رسائل کے علاوہ پنجاب گزٹ کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے یہ حوالہ امداد صابری کی تاریخ صحافت کی تیسری جلد سے لیا ہے۔(۲۰)

مندرجہ بالا ان حوالوں سے منشی غلام قادر فصیح کے رسالے ''پنجاب گزٹ'' کے اجراء اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے ممتاز صحافی اور مدیر تھے جو صحافت کے میدان میں آئے اور کامیابی حاصل کی۔

سیالکوٹ میں غلام قادر فصیح کے گھر کے قریب ہی مرزا غلام احمد قادیانی کا گھر تھا جہاں بیٹھک ہوتی تھی۔ چونکہ فصیح صاحب یار باش آدمی تھے اس لیے مرزا قادیانی سے بھی میل جول بہت زیادہ تھا۔ مرزا کی بھی اُن پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ غلام قادر فصیح بھی مرزا سے بڑے متاثر تھے۔ اسی لیے مرزائیت کے حق میں چند کتابیں بھی لکھیں اور مرزا قادیانی کے ساتھ ان کے حمایتی کے طور پر مناظروں میں بھی شریک ہوتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا علم و فضل ان کی ہدایت بن کر سامنے آیا۔ ایک دن بھری محفل میں فصیح صاحب نے مرزا قادیانی سے کہا کہ مرزا صاحب آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔ انہوں نے کہا پوچھیے جی پوچھیے۔ دریافت کیا کہ تاریخ میں جو لکھا ہے کہ پیغمبروں کی شکل وصورت اور شخصیت میں ایک خاص رعب و دبدبہ اور جلال ہوتا ہے لیکن کیا بات ہے کہ آپ میں پیغمبرانہ شان نظر نہیں آتی؟ اس بات کا کوئی تسلی بخش جواب مرزا سے نہ بن پڑا اور وہ محض یہ کہہ کر رہ گیا کہ ''اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے دل کی آنکھیں کھول دے۔'' اور پھر واقعی دل کی آنکھ کھل گئی اور ہدایت یوں نصیب ہوئی کہ ہاتھ میں قلم کی طاقت تو پہلے ہی سے موجود تھی، چھاپہ خانہ بھی اپنا تھا، مرزا قادیانی اور اس کی قادیانیت کے خلاف

اتنا لکھا کہ پچھلے سارے دھونے دھل گئے۔(۲۱)

قادیانیت سے یہ بیزاری وراثتی طور پر غلام قادر فصیح کے بیٹے ظفر اقبال میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ اگر چہ ظفر اقبال کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور کسی گروہ یا پارٹی کے حق میں نہ تھے البتہ ایک دفعہ جنرل ایوب خان کے دور میں بنیادی جمہوریت کے الیکشن ہو رہے تھے۔ محلے میں ایک قادیانی کھڑا ہو گیا۔اتفاق ایسا تھا کہ محلے میں اس کے مقابلے پر کوئی بھی شخص کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ پروفیسر صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے پریشانی کا اظہار کیا اور محلے کے ایک بزرگ جو ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ ڈپٹی رجسٹرار تھے انہیں کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ یہی نہیں بلکہ عملی دلچسپی لی۔ پبلک میٹنگوں میں تقریریں کیں اور انہیں کامیاب کروانے میں اپنی پوری صلاحیتیں اور اثر ورسوخ استعمال کیا۔۔۔لوگ اس بات پر حیران تھے لیکن یہ عقائد کا ٹکراؤ تھا جس کے لیے پروفیسر صاحب نے میدانِ عمل میں آنا ہی تھا،اس بات کا شعور محلے داروں کو صحیح طور پر نہیں تھا۔(۲۲)

''رئیس قادیان'' میں فصیح صاحب کا تعلق مرزا غلام قادیانی سے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''۲۰ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو مرزا قادیانی اپنے بارہ ساتھیوں کے ہمراہ جامع مسجد دہلی میں میاں نذیر حسین صاحب سے حیاتِ مسیح پر مناظرہ کرنے کے لیے لیت ولعل کرتے رہے اور باقاعدہ بحث نہ کر سکے اور پولیس کی حفاظت میں مسجد سے واپسی ہوئی۔ اس موقع پر مرزا صاحب کے ساتھ مولوی عبدالکریم سیالکوٹی، سید امیر علی، غلام قادر فصیح۔۔۔وغیرہ تھے۔''(۲۳)

سعیدہ اقبال کہتی ہیں کہ چونکہ اس وقت تک قادیانیوں کو غیر مسلم قرار نہیں دیا گیا تھا اس لیے فصیح صاحب نے بھی اس میں عار نہ سمجھا۔دوسری وجہ میرے رائے میں یہ ہے کہ غلام قادر فصیح وسیع المشرب انسان تھے اسی لیے ان کے حلقہ احباب میں مسلمان، ہندو اور عیسائی بھی شامل تھے۔فصیح ایک غیر متعصب انسان تھے۔اُن کے اپنے جو بھی مذہبی نظریات و

عقائد تھے ان کے مطابق وہ غلام احمد سے ذہنی طور پر زیادہ قریب تھے۔ اپنے نظریات وافکار کا بیان اور اسکے لیے دلائل دینا اور چند کتابیں لکھنا ان کے اپنے نظریات کا بیان تھا نہ کہ غلام احمد قادیانی کے رد کے طور پر۔ اس کے علاوہ حقائق سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ غلام احمد قادیانی زیادہ تر ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرے کرتے تھے۔ (۲۴)

اسی طرح جب ہم اُس ماحول اور دور کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں غلام قادر فصیح نے زندگی کے شب وروز گزارے اور جن احباب کے ساتھ وہ اٹھتے بیٹھتے تھے اُن میں تقریباً سبھی غیر متعصب تھے اور انسانی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے۔

میر حسن کے بھائی سید عبدالغنی کے نام سرسید نے ایک خط لکھا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں لکھا:

> "۔۔۔۔۔حضرت مرزا (غلام احمد) صاحب (قادیانی) کی نسبت زیادہ کد وکاوش کرنی بے فائدہ ہے۔ ایک بزرگ، زاہد، نیک آدمی ہیں جو کچھ خیالات ان کے ہو گئے ہوں، ہو گئے ہوں۔ بہت سے نیک آدمی ہیں جن کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم کو ان سے نہ کچھ فائدہ ہے نہ نقصان (مگر) ان کی عزت اور ان کا ادب کرنا بہ سبب ان کی بزرگی اور نیکی کے لازم ہے۔ ان کے خیالات کی صداقت و غیر صداقت سے بحث محض بے فائدہ ہے۔ ہمارے لیے مفید ہمارے اعمال ہیں۔ ان کے اچھے ہونے پر کوشش کرنی چاہیے۔
>
> الہ آباد ۱۴ نومبر ۱۸۹۲ء
>
> فقط
>
> خاکسار
>
> سید احمد (۲۵)

مرزا غلام احمد جب ملازمت کے سلسلے میں سیالکوٹ میں ٹھہرے تھے تو میر حسن صاحب کے مرزا صاحب سے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کسی خط میں میر صاحب نے مرزا غلام

احمد کے دعویٰ نبوت کے متعلق سرسید کو لکھا تو جواب میں سرسید نے لکھا:

''مرزا غلام احمد قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے اگر نہیں ہوتا تو صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے۔ وہ جو ہوں 'سو ہوں' اپنے لیے ہوں۔۔۔۔'' (۲۶)

اس غیر متعصب ماحول اور ایسے وسیع المشرب علماء کی صحبت میں غلام قادر فصیح نے زندگی گزاری۔ وہ فطری طور پر خود بھی اعلیٰ ظرف اور یار باش آدمی تھے۔ اس طرح ان کی مخالفت یا حمایت ان کے اپنے نظریات وافکار کی بنیاد پر تھی نہ کہ شخصی حوالوں پر۔

ازدواجی زندگی:

غلام قادر فصیح کے ازدواجی حالات کے حوالے سے یہ بات پتا چلی کہ ان کی بیوی بھولاں بی بی کو اٹھرا کی بیماری تھی اس لیے ان کے بچے بچتے نہیں تھے۔ کھیلنے کی عمر کو پہنچتے تو فوت ہو جاتے۔ اس بیماری کے علاج کے لیے ان کی بیوی بھولاں بی بی کڑوی کسیلی چیزیں کھایا پیا کرتی تھیں۔ سوڈا واٹر اور ریٹھوں کا پانی کثرت سے استعمال کیا کرتی تھیں۔ یہ دیسی اور گھریلو ٹوٹکے مفید ثابت ہوئے۔ شادی کے بہت عرصے کے بعد ظفر اقبال کی پیدائش ہوئی۔ ظفر اقبال کی بیوی زبیدہ بیگم اپنی بہو مسز عارفہ سعید (سعید اقبال کی زوجہ) سے کہا کرتی تھیں کہ تمہارا یہ سسر اسی وجہ سے نظم وضبط کا پابند اور غصے کا تیز ہے کہ ان کی پیدائش سے قبل ان کی والدہ نے اتنی کڑوی چیزیں کھائی پی تھیں۔ ظفر اقبال کی پیدائش کے چودہ (۱۴) سال بعد ڈاکٹر ریاض قدیر پیدا ہوئے اور پھر ایک بہن مریم اس دنیا میں آئیں۔ (۲۷)

غلام قادر فصیح نے دوسری شادی حکیم نوردین کی سالی سے کی جن کا تعلق قادیانی گروپ سے تھا۔ اس حوالے سے دو آرا سامنے آتی ہیں۔ پہلی رائے ڈاکٹر سعید اقبال کی ہے۔ ان کے مطابق چونکہ ان کی پہلی بیگم سے جو اولاد ہوتی تھی وہ بچتی نہیں تھی اس لیے انہوں نے حکیم نوردین

کی سالی سے دوسری شادی کی تھی جس سے ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام سکینہ تھا جسے ہم بڑی آپا سکینہ کہہ کر بلاتے تھے کیونکہ ہماری ایک خالہ کا نام بھی سکینہ تھا۔ظفر اقبال ''بڑی آپا سکینہ'' کی بڑی قدر کرتے تھے۔بیگم عارفہ سعید کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ فصیح صاحب مرزا قادیانی کے اثر سے جب نکلے تو انہوں نے دوسری بیگم سے رشتہ منقطع کرلیا اور انہیں طلاق دے دی۔(۲۸)

دوسری رائے مسز سعیدہ احسن کی ہے۔ان کا اس بارے میں کہنا ہے کہ

> ''مرزا قادیانی نے قادیان کی شہزادیوں میں سے کسی ایک سے دادا جی کی شادی کرادی۔والدہ بتاتی ہیں کہ ان کے میکے والے آتے تھے تو وہ فارسی بولا کرتے تھے۔کم عمری ہی میں دوسری بیگم وفات پا گئیں۔ان کی بیٹی سکینہ بھی ماں کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ہی فوت ہو گئی۔(۲۹)

دوسری شادی کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ غلام قادر فصیح کے بھائی میاں غلام علی نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ان کی دوسری شادی کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی ہر سال اپنے بھائیوں کے ساتھ حج کے لیے جاتی تھیں جس پر ان کے میاں ان سے کہتے تھے کہ بچے چھوٹے ہیں ان کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے لیکن جب انہوں نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا تو میاں غلام علی نے دوسری شادی کر لی۔ڈاکٹر سعید اقبال اس بارے میں کہتے ہیں کہ ہماری والدہ (زبیدہ بیگم) اپنی سوتیلی والدہ کے حسنِ سلوک کا ذکر کرتی تھیں۔زبیدہ بیگم نانا کے بچوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔(۳۰)

غلام قادر فصیح کی بیوی ''بھولاں'' انتہائی صابر شاکر، دھیمی طبیعت اور بچوں کی تربیت کے معاملے میں بہت سنجیدہ اور غیرت مند خاتون تھیں۔فصیح صاحب کی وفات کے وقت ان کے بڑے بیٹے ظفر اقبال ابھی دسویں جماعت میں تھے۔تنگ دستی نے انہیں آگھیرا تھا۔بچوں کے تایا میاں غلام علی سیالکوٹ کے رئیس اعظم تھے اور ان کے بچے بہت ٹھاٹ سے رہتے تھے۔اس خیال سے کہ بچے اپنے تایا زاد بچوں کی آسودہ حالی سے متاثر ہو کر کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیں انہوں نے اپنے بچوں کو اپنے امیر عم زادوں سے کم سے کم ملنے دیا۔شوہر کی وفات کے بعد بے جی نے نہ کبھی خود اور نہ بچوں کو ہی کبھی کسی کے سامنے ایسا تاثر دینے کی اجازت دی کہ انہیں کسی چیز کی

ضرورت ہے۔(۳۱)

خود بیان کیا کرتی تھیں کہ فصیح صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد سیالکوٹ کا ایک مشہور دیوان چرن داس اپنے دوست فصیح صاحب کے بچوں کو دیکھنے گھر آیا۔ ریاض چھوٹا سا تھا یہ نکلا تو اُس نے ریاض کو اٹھا کر گلے لگالیا اور پیار کیا۔ جب اسے نیچے اتارا تو ایک آنہ بھی دے دیا۔ میں دروازے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ریاض کا وہ ہاتھ پکڑا جس میں آنہ تھا اور اسے چھین کر چرن داس کے پاؤں میں پھینک دیا اور کہا ''خبردار میرے بچوں کو کوئی پیسے نہ دیا کرے'' چرن داس نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتادی چنانچہ اس کے بعد کسی نے فصیح صاحب کے بچوں کو نقدی کی شکل میں انعام وغیرہ دینے کی کوشش نہ کی۔''(۳۲)

اسی طرح ایک اور واقعہ روایت کیا جاتا ہے کہ فصیح صاحب کی وفات کے بعد کسی عزیز نے عید کے موقع پر بچوں کے لیے کپڑے بھجوائے تو انہوں نے فوراً واپس کر دیے۔(۳۳)

ظفر اقبال سمیت ان کے تمام بچے اپنی والدہ کو ''بے جی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ بے جی کے حوالے سے ایک اور روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ

بے جی کا اپنے وسائل کے اندر گزارا کرنے کی صفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چونکہ بازار سے گرم کپڑا خریدنے کی گنجائش کم ہی ہوتی تھی اس لیے خود سوت کات کر کپڑا تیار کر لیتی تھیں اور کھیس، بستر اور چادریں بھی خود ہی بنا لیتی تھیں۔ ان کے بچے ریاض اور مریم ازار بند بنانے میں اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ دیگر رشتے داروں کے بچے میٹھی گولیاں بازار سے خرید کر کھاتے اور یہ گھر میں استعمال ہونے والی دیسی شکر کی ریوڑیاں نما گولیاں بنا کر اپنے بچوں کو دیتی تھیں لیکن رشتے داروں کے ساتھ ان کا تعلق یہ تھا کہ کوئی غریب بہن بھائی اگر ضرورت مند ہوتا تو اپنی تنگ حالی کے باوجود اس کی ضرور مدد کرتیں۔ عزیزوں اور بچوں کو عیدی بہت اہتمام سے دیتیں۔ یوں عزتِ نفس کی پاسداری کے عملی نمونے بچوں کے لیے براہ راست ایک اسوہ حسنہ بن گئے اور عزتِ نفس کی حفاظت، باکفایت زندگی گزارنے اور رشتے داروں خاص طور پر غریب رشتے داروں کی مدد کی عادت ان کے بچوں نے ان سے بدرجہ اتم لی۔ دونوں بیٹوں نے تمام عمر صدقہ وخیرات اور غریب پروری میں نیز غریب رشتہ داروں سے حسنِ سلوک میں اپنی والدہ کے نمونے کو ہمیشہ سامنے

رکھا۔(۳۴)

شوہر کی وفات کے بعد بعض مشکل حالات کی وجہ سے بے جی کا اپنے سسرال میں رہنا ناممکن ہو گیا اس لیے وہ اپنے بچوں سمیت محلہ کمہاراں سے اپنی بہن بھاگن کے ہاں میانہ پورہ میں آ گئیں۔اس کی تفصیل ان سے یوں مروی ہے:

ظفر کے تایا میاں غلام علی نے ہمیں اسی مکان میں آباد رہنے کی پیشکش کی لیکن میں نے قبول نہیں کی۔ مجھے خیال گزرا کہ ان بچوں کے تایا زاد بھائی فیض علی، رحمت علی وغیرہ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہیں گے تو اس کا ان پر برا اثر پڑے گا۔اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر میانہ پورہ آ گئی۔ وہاں میری بھانجی صغریٰ کا گھر خالی تھا کیونکہ وہ سرگودھا رہتی تھی۔میں نے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ظفر کی شادی کے بعد اس کے تایا نے اس کا آبائی مکان اس کی بیوی اور اپنی بیٹی زبیدہ کو دے دیا لیکن پھر بھی نہ ظفر وہاں گیا نہ میں۔زبیدہ نے اپنا مکان اپنے بھائی رحمت علی کو، جو ان دنوں کچھ مالی پریشانی میں تھا، رہائش کے لیے دے دیا اور بعد میں اسے بیچ کر اپنی بہن سکینہ کا قرض ادا کر دیا۔(۳۵)

فصیح صاحب کا بھی اپنی زندگی میں ان (زبیدہ بیگم) سے بہت لگاؤ تھا۔وہ خود بتایا کرتی تھیں کہ جب میں کھیلتے کھیلتے ان کے پاس چلی جاتی تھی تو وہ مجھے بطورِ خاص پاس بلا کر پیار کرتے اور پھر ایک دونی بھی ملتی تھی۔(۳۶)

غلام قادر فصیح مالی اعتبار سے مضبوط تھے اور پھر جب انہوں نے پنجاب پریس کھولا تو نہ صرف وہ خود بلکہ اس پریس میں کام کرنے والے لوگ بھی خوشحال ہو گئے۔نفیس رقم کے والد منشی عبدالعزیز بیان کرتے ہیں کہ گاؤں کے آدمی جو پریس میں کام کرتے تھے انہیں ان کا معاوضہ کوڑیوں کی صورت میں ملا کرتا تھا اور یوں جب وہ کئی مہینے کام کر کے چند روپے لاتے تھے تو لوگ ان روپوں کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر جمع ہو جایا کرتے تھے۔(۳۷)

محترمہ سعیدہ احسن نے بتایا کہ

> ''والدہ بتاتی تھیں کہ دادا اتنے سخی اور کھلانے پلانے والے تھے کہ دسترخوان پر کبھی تنہا نہ ہوتے۔تیس چالیس آدمی ان کے ساتھ کھانا کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ان کی

کتابیں بہت بکتی تھیں جس کی وجہ سے پیسہ بہت آتا تھا لیکن
یہ پیسہ ان کو جمع کرنا کبھی نہ آیا۔ ان کا دستر خوان ایسا تھا جیسے لنگر
لگا ہو۔ اگر آمدن زیادہ تھی تو اخراجات بھی زیادہ تھے۔ ہاتھوں
میں جیسے سوراخ تھے'' (۳۸)

''غلام قادر فصیح تواضع کرنے والے، آنے جانے والوں کی عزت کرنے والے اور دوستوں کی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے والے تھے۔ لوگ آ جا رہے ہیں کھا پی رہے ہیں۔ دستر خوان پر دو چار آدمی تو کبھی نہ ہوتے بلکہ تیس چالیس سے کم نہ ہوتے اس دریا دلی اور سخاوت کا نتیجہ تھا کہ کبھی روپیہ جمع نہ کر پائے بلکہ وفات پر معاملہ قرض پر تھا۔ مکان وغیرہ گروی رکھا ہوا تھا۔''(۳۹)

فصیح صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی کفالت کا ذمہ ان کے تایا میاں غلام علی نے اٹھا لیا جو جون ۱۹۱۷ء تک قائم رہا۔ یہ کم و بیش پانچ سال کا عرصہ بنتا ہے جس کے دوران انہیں ان کے تایا ماہانہ وظیفہ دیتے رہے پروفیسر صاحب نے ان تمام امدادی رقوم کا حساب اپنی والدہ کے حکم سے لکھنا شروع کر دیا یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ قرض حسنہ ہے جسے واپس ادا کرنا ہے۔ اور نوکری پر جیسے ہی کھڑے ہوئے بچت شروع کر دی اور بتدریج چار اقساط میں یہ رقم لوٹا دی اور اس سلسلے میں ایک تفصیلی خط بھی روانہ کر دیا جس میں تمام ادائیگیوں کو وضاحت سے لکھ دیا گیا اور جس جس مہینے میں جو رقم قرض کے طور پر لی گئی تھی اس کا بھی مکمل ریکارڈ مہیا کر دیا گیا تھا۔ (۴۰)

ظفر اقبال والدہ کی ہر بات کا خیال رکھتے تھے جیسے وہ کہتیں اس طرح عمل کرتے۔ والدہ کی وفات کے بعد جب تایا صاحب نے مالی مدد دینا شروع کی تو ماں کے فرمان پر اس کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا شروع کر دیا اور وقت آنے پر پوری پوری ادائیگی کر دی۔ (۴۱)

پروفیسر صاحب (مولوی ظفر اقبال) نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو انہیں گھر کی حدود میں ہی اپنے والد کا پریس چلتا، کاتب آتے جاتے، کتابیں چھپتیں اور اخبار شائع ہوتے نظر آتے اس ماحول میں پرورش پانے سے اس کام کی طرف ان کا میلان ہونا ایک طبعی امر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی آپ تعلیم سے فارغ ہوئے آپ نے تصنیف و تالیف اور طباعت و اشاعت کے میدان میں بے دھڑک قدم رکھ دیا اور ابھی آپ کی عمر تیس برس بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ کی تیار کی ہوئی عمدہ درسی کتب طلبہ کے ہاتھوں تک پہنچ چکی تھیں جو کئی عشروں تک بطور نصاب بھی پڑھی

پڑھائی جاتی رہیں۔(۴۲)

گھر میں اپنے والد بزرگوار کی صورت میں صحیح علمی وسیاسی سرگرمیوں کے ایک حسین امتزاج کو اپنے قریب ہی موجزن دیکھنے کا موقع ملا۔ والد ایک طرف سیاست کی سرگرمیوں میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے تو دوسری طرف صحافت اور اعلیٰ تصنیف وتالیف کے کاموں میں۔ انہوں نے اس دور میں امریکن مشن ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا جب اتنی تعلیم پانا بھی کم کم مسلمانوں کو نصیب ہوتا تھا۔ پھر ان کے علمی مشاغل اس بات کی بالصراحت غمازی کرتے ہیں کہ انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔۔۔۔۔پھر ان کی والدہ کی بہترین نگرانی اور اعلیٰ تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔(۴۳)

غلام قادر فصیح بچوں کی تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔۱۹۱۲ء میں جب فصیح صاحب انتقال پا گئے تو اس وقت ظفر اقبال دسویں کا امتحان دے رہے تھے۔ اس فوتیدگی سے گھر کے حالات بالکل تلپٹ ہو گئے۔ فصیح زیر بار تھے جس کی وجہ سے ان کی تمام جمع پونجی اور مکان وغیرہ قرضے کی ادائیگی میں ہی ہاتھ سے نکل گئے۔(۴۴)

حالات کے تغیر کے بارے میں نذیر احمد نے پروفیسر کی والدہ سے روایت کیا ہے کہ

ظفر کے والد اپنے زمانے کے بہت مانے ہوئے شخص تھے۔ سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ شہر کے امراء فصیح صاحب کے ذاتی دوست تھے۔ کیا ہندو، کیا سکھ، کیا عیسائی، کیا مسلمان سب آپ کی محفل میں موجود ہوتے تھے۔۔۔۔بچوں کی پرورش پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ لیکن جب بیمار پڑے اور نظر آنے لگا کہ اب بچ نہ سکیں گے تو میں نے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ مجھ پر یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ گھر کی ہر چیز سمیت مکان گروی ہے۔ فصیح صاحب نے اپنے شاہانہ اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی تمام چیزیں بھائی کے پاس گروی رکھوا دی تھیں۔ ساری زندگی میں نے خاموشی سے فرمانبرداری میں گزاری تھی لیکن اس دن میں پریشانی میں پھٹ پڑی اور اُن سے پوچھ ہی بیٹھی: یہ جو تمہارے ناز ونعم میں پلے بچے ہیں ان کا کیا بنے گا؟ مری جھنجھلاہٹ پر پہلے تو کہنے لگے: کیا یہ بچے صرف میرے ہیں؟ میں اس سوال پر ٹھٹھک گئی۔ پھر کہنے لگے: تم پارسا عورت ہو انشاء اللہ یہ بچے نیکی تمہاری لیں گے اور دماغ میرا۔ تم پریشان نہ ہو۔۔۔۔وقت گزر گیا اور اس نے ان کی یہ بات سچ کر دکھائی۔ بچے نیک بھی ہوئے

اور قابل بھی۔۔۔۔۔جیسے ہی ان کے دم پورے ہوئے یوں لگتا تھا کہ پورا شہر سیالکوٹ امڈ کر ہمارے دروازے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ کیا امراء کیا غریب سب جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ صبح ظفر کا امتحان تھا۔ میں نے اس سے کہا: اٹھو، نہاؤ، کپڑے پہنو، اپنے کاغذ پکڑو اور امتحان کے لیے نکل جاؤ۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ اگر امتحان میں نہ بیٹھا تو فیل قرار دیا جائے گا۔ ظفر نے بھی انکار نہ کیا۔ جب تیار ہو کر گھر سے نکلا تو خلقت نے شور مچا دیا: میاں جی کہاں چلے ہو، جنازہ پڑھنا ہے۔ میں نے اندر سے بآواز بلند کہا: اسے مت روکو۔ لوگوں نے سوال کیا میاں جی کا جنازہ؟ میں نے کہا: جب یہ واپس آئے گا تو جنازہ اٹھے گا۔ چنانچہ ظفر امتحان دینے گیا اور اس کے واپس آنے پر جنازہ اٹھا۔ اس امتحان کا جب نتیجہ نکلا تو وہ اول رہا۔ (۴۵)

قرآن فہمی:

قرآن فہمی کا شوق اس دین دار خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ فصیح صاحب کے دادا قائم الدین حافظ قرآن تھے اور اپنی نیک نامی اور معرفت کی بنا پر ولی اللہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے اپنے بیٹے احمد علی کے قرآن حفظ کرنے پر اپنی والدہ کو مبارک دی اور کہا کہ ماں مبارک ہو تیرے پوتے نے قرآن حفظ کر لیا ہے۔ والدہ نے جواب میں کہا: بیٹا مبارک باد کی مستحق تو تیری بیوی اور احمد علی کی ماں ہے جس کے بیٹے نے قرآن پاک حفظ کیا ہے اور بیٹے کی اس نیکی کے بدلے ماں قیامت کے دن پردے میں اٹھے گی۔ یہ باب سن کر حافظ عبداللہ نے ماں کے سکونِ قلب اور قیامت کے دن پردے میں اٹھائے جانے کی آرزو کو پورا کرنے کے لیے قرآن پاک حفظ کیا اور نہ صرف یہ بلکہ خود عمدہ و نفیس کاغذ تیار کیا، قرآن پاک کی کتابت کی اور والدہ ماجدہ سے کہا کہ ماں! مبارک ہو تیرا بیٹا حافظ قرآن ہو گیا۔ عبداللہ صاحب کا کتابت شدہ قرآن پاک ان کے پڑپوتے (غلام قادر فصیح کے پوتے) ڈاکٹر سعید اقبال کے پاس موجود ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سعید اقبال نے بتایا:

> ''ہمارے پردادا کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید بڑی دیر
> ہم سے الگ رہا۔ یہ قرآن پاک دراصل دادا (غلام قادر فصیح)
> کے بھائی کے خاندان میں تھا۔ جب میری بیٹی عروبہ سعید نے

ظفر اقبال پر تھیسز لکھنا شروع کیا تو اس قرآن پاک کے حوالے کی ضرورت پڑی اور میں نے ان سے کہا کہ وہ قرآن پاک ہمارے حوالے کر دیں۔ یہ تائید ایزدی تھی یا شوق اور لگن کہ وہ قرآن پاک اب میرے پاس اسی طرح محفوظ ہے۔ اس کی جلد بندی میں نے ضرور کروائی تا کہ وہ زیادہ محفوظ رہے۔ البتہ ابھی تک وہ انہی غلافوں میں لپٹا ہوا ہے جس میں پردادا صاحب نے انہیں لپیٹا تھا۔" (۴۶)

ڈاکٹر سعید اقبال نے اپنے والد ظفر اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ

"والد صاحب (ظفر اقبال) فرماتے تھے کہ والد (غلام قادر فصیح) سے سنا ہے کہ قرآن کا کام کرنے والے کو دنیا میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔" (۴۷)

غلام قادر فصیح کا میلان طبع اپنے آباء کی نسبت ادب و سیاست اور صحافت کی جانب تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف اور احباب کی محفلوں میں گزاری۔ ان کے حلقہ احباب میں نہ صرف مسلمان، ہندو، عیسائی بلکہ قادیانی بھی شامل تھے۔ تاہم چونکہ ان کا تعلق ایک اسلامی گھرانے سے تھا اور موروثی طور پر قرآن فہمی کا شوق انہیں ودیعت ہوا تھا۔ اس لیے حافظ عبداللہ کا بیٹا ہونے کے ناتے انہیں بھی قرآن کی اشاعت کا کچھ نہ کچھ موقعہ من جانب اللہ میسر آ گیا۔ انہوں نے پہلا پارہ اردو، فارسی اور انگریزی ترجمے کے ساتھ چھاپا۔ اس کے علاوہ سورۃ فاتحہ اور قرآن کی آخری چار سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر بھی شائع کی۔

منشی پروین رقم کے والد منشی عبدالعزیز اور دادا مولوی پیر بخش خوش نویس تھے جو ایمن آباد کے رہنے والے تھے۔ پروین رقم اپنے دور کے اچھے کاتبوں سے اصلاح لیتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ پیدائش ہی سے ایسا دماغ لے کر آئے تھے جو کسی اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا۔ جوہر گوشے سے متمتع ہوتا اور ہر خرمن سے خوشہ حاصل کر لیتا ہے۔ انہوں نے خداداد صلاحیت سے فن خوش نویسی میں ایک نئی طرز ایجاد کی جو ان سے پیش رووں سے قدرے مختلف اور خوبصورت ہے۔ آج کا ہر خوش نویس ان کی پیروی کر رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام کی کتابت کے لیے

انہی کو پسند کیا۔ منشی صاحب لوہاری منڈی میں رہتے تھے۔ (۴۸)

پروین رقم اور زریں رقم سے پروفیسر (ظفر اقبال) کے مراسم بہت گہرے تھے۔ عبدالعزیز مشرقی نے ملتان سے جو خط ظفر اقبال کو لکھا اس سے پتا چلتا ہے کہ مولوی ظفر اقبال نے فصیح صاحب کی تاریخ اسلام کی کتابت ایک دفعہ انہی سے کروائی تھی۔

''آپ نے تاریخ اسلام کی کتابت زریں رقم سے کروا کر رکھ چھوڑی ہے۔ میں نے اپنا ظفر پریس وقف کر دیا ہے۔ آپ وہ نہیں چھاپتے تو مجھے دیجیے۔ میں چھاپ دوں۔'' (۴۹)

چوبرجی سے میانی صاحب کو جاتے ہوئے جناز گاہ کے سٹاپ پر دائیں جانب جو سڑک جاتی ہے اس کا نام فصیح روڈ ہے۔ ''میونسپل کارپوریشن لاہور نے ریزولیوشن نمبر ۱۰۶۴ کے تحت مورخہ ۴ جون ۱۹۵۶ء کو اسلامیہ پارک لاہور میں واقع ایک سڑک کا نام فصیح روڈ رکھا'' (۵۰) اسی فصیح روڈ پر اندر کی طرف سیدھے چلتے جائیں تو شبلی سٹریٹ میں پہلا مکان ہے جس کی پیشانی پر ''فصیح منزل'' کی تختی جگمگا رہی ہے۔ مولوی ظفر اقبال کو اپنے والد غلام قادر فصیح سے محبت و عقیدت تھی جس کی بنا پر انہوں نے جب یہ مکان بنوایا تو اس کا نام فصیح منزل رکھا۔

> ''فصیح منزل'' کے حوالے سے ایک دلچسپ بات عفت اقبال نے یہ بتائی کہ سیالکوٹ کے محلہ کمہاراں میں جس گھر میں فصیح صاحب کی رہائش تھی اس کا نام بھی فصیح منزل تھا جس میں ان کا ذاتی پریس ''پنجاب پریس'' واقع تھا۔ اس میں ان کے بھتیجے میاں فیض علی بھی ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔'' (۵۱)

مولوی ظفر اقبال نے ''فصیح منزل'' کی تختی مشہور کاتب پروین رقم سے لکھوائی۔ یہ دلچسپ واقعہ ڈاکٹر سعید اقبال نے اس طرح بیان کیا:

''جب یہ مکان ۱۹۳۸ء میں بنا تو ظفر اقبال نے چاہا کہ وہ ایک کتبہ لکھوائیں جس پر فصیح منزل تحریر کروایا جائے۔ اپنے والد سے دلی لگاؤ کی بنا پر چاہتے تھے کہ اُس وقت کے مانے ہوئے کاتب پروین رقم سے یہ کتبہ لکھوایا جائے۔ پروین رقم سے جب ظفر اقبال کی بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ دو سو روپے لوں گا۔ ابا جی نے کہا کہ پچیس روپے دوں گا۔ پروین نے کہا کہ نہیں

مولوی صاحب دوسو روپے ہی لوں گا ورنہ زریں سے لکھوالیں۔ ابا جی نے کہا نہیں لکھتے تو نہ لکھو میں تو ۲۵ روپے ہی دوں گا۔ مولوی ظفر اقبال کا پڑھے لکھے کاتبوں سے گہرا تعلق تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ظفر اقبال ایک دن سائیکل پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں پروین رقم نے آواز دے کر متوجہ کیا اور پوچھا کہ مولوی صاحب وہ کتبہ تو لکھوالیا ہوگا آپ نے۔ مولوی ظفر اقبال نے کہا کہ جب تک تم جیتے ہو، تمہی یہ کتبہ لکھو گے۔ ہاں البتہ تمہارے بعد زریں سے لکھوانے کا سوچوں گا۔ یہ سن کر پروین رقم نے کہا ''مولوی صاحب! آپ نے قدر کی ہے تو لائیں ۲۵ روپے، میں لکھ دیتا ہوں۔'' اس طرح یہ کتبہ لکھوایا گیا۔'' (۵۲)

اس کتبے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس پر جو ''فصیح منزل'' لکھا گیا ہے تو اس میں فصیح کاف کا نقطہ اوپر نیچے دائیں بائیں کہیں نظر نہیں آتا کیونکہ اس طرح اس تحریر کا تناسب ایک سا نہیں رہتا تھا۔ پروین رقم نے انتہائی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ف کا نقطہ ف کے گول والے ابتدائی حصے کے اندر اس طرح کھودا ہے کہ ذرا غور کرنے پر ف کا نقطہ اس کے اندر ہی موجود نظر آتا ہے۔ یہ لکھنے والے کی دلجمعی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ (۵۳)

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی تاریخ یعنی ۱۹۳۸ء اس شعر سے نکالی گئی ہے۔

بخشے خالق جسے زمین پہ حق — عاقبت متقین کی ہے الحق

۱۹۳۸ء — ۱۳۵۷ھ

ڈاکٹر سر محمد اقبال سے پروفیسر ظفر اقبال کے خاندانی تعلقات تھے۔ سیالکوٹ میں ڈاکٹر صاحب اور منشی غلام قادر فصیح کی اکٹھی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ (۵۴)

سید نذیر نیازی نے 'دانائے راز'' میں اقبال کے احباب کے متعلق بڑی تفصیل دی ہے۔ سیالکوٹ کے حوالے سے دیگر احباب کے علاوہ غلام قادر فصیح اور ظفر اقبال سے اقبال کے تعلق کو بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''غلام قادر فصیح مرحوم سیالکوٹ کے ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ شاعری تو بہت کم کی یا شاید کی ہی نہیں البتہ نثر میں ان کے قلم نے بڑی جولانیاں دکھائی ہیں۔ تاریخ اسلام سے انہیں بالخصوص شغف تھا۔ فصیح صحافی بھی تھے، طابع اور ناشر بھی۔ پنجاب پریس کے نام سے ایک مطبع قائم کر رکھا تھا۔ تاریخ اسلام کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالتے جس میں غزوات نبی ﷺ اور

فتوحات عہد صدیقی و فاروقی کا حال بڑی تفصیل سے بڑے سلیس اور دل نشین انداز میں بیان کرتے۔ ان کی تحریروں سے نوجوانان اسلام میں جا بجا مجاہدین اسلام کے عزم و ہمت، ان کے تاریخی کارناموں، اسلام کے لیے سرفروشی کے جذبات کی یاد تازہ ہو جاتی۔ محمد اقبال کے نزدیک یہ بھی مسلمانوں میں شعور ملی کے احیاء کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ کہتے ہیں ''یہ رسالہ ہر مسلمان کے گھر پہنچنا چاہیے۔ ایسی ہی تحریروں سے قوم میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ میں اسے پڑھتا ہوں تو اکثر چشم پرآب ہو جاتا ہوں۔'' فصیح مرحوم ۱۹۱۲ء میں فوت ہوئے۔ ان کے صاحبزادے ظفر اقبال کو تصنیف و تالیف کا مشغلہ ورثے میں ملا۔ میر حسن کے حلقۂ درس میں بیٹھے۔ ان کی شاگردی کی۔ عربی زبان میں بڑی مہارت پیدا کی۔ لاہور آئے۔ ایم۔ اے کیا، ٹریننگ کالج میں ملازمت مل گئی۔ عربی زبان میں درسیاست کی تصنیف کے علاوہ انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے لیے قرآن مجید کا نسخہ بڑی محنت سے مرتب کیا اور پھر پیکجز کے زیر اہتمام ایک دوسرا نسخہ اس انداز سے کہ قاری کو اس کی تلاوت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مولوی صاحب کی یہ خدمت لائق صد تحسین ہے جن کے لیے قوم ان کی شکر گزار رہے گی۔ سیالکوٹ کے ایک مولوی نواب دین صاحب نے چوک دال گراں میں مقبول عام کے نام سے ایک مطبع قائم کر رکھا تھا۔ ظفر اقبال اکثر وہاں جاتے۔ ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ حکیم الامت کا مجموعۂ کلام چھپ رہا ہے۔ پروف رکھے تھے۔ ان پر نظر ڈالی تو دیکھا، ان میں غلطیاں ہی غلطیاں ہیں۔ محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پروفوں کا ذکر کیا تو انہوں نے ہدایت کر دی کہ آئندہ ان کی جو بھی کتاب شائع ہو۔ اس کے پروف مولوی ظفر اقبال دیکھیں۔'' (۵۵)

غلام قادر فصیح نے جب اپنے رسالے ''تاریخ اسلام'' میں تاریخ اسلام قسط وار چھاپنا شروع کی تو ڈاکٹر اقبال نے غلام قادر فصیح کے نام ایک خط لکھا اور رسالے سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار یوں کیا:

> ''میرے نزدیک یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لیے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں کہ اس قسم کے تاریخی رسالے شائع کیے جائیں جن

سے ان کو اسلاف کے حالات معلوم ہوں اور ان کے طرزِ عمل کا ان پر اثر پڑے۔ قوموں کی بیداری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی تاریخ سے کہاں تک دلچسپی ہے۔ آپ کے رسالے کی اشاعت سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان کہاں تک اپنے اسلاف کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

حالاتِ موجود کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ایک قسم کی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور تاریخی مضامین کو نہایت توجہ سے سنا جاتا ہے۔ اس واسطے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا رسالہ برمحل نکلا ہے اور ہماری ضروریاتِ موجودہ کا کفیل ہوگا۔

خود مجھ پر جو اثر اس کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار میں اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ بسا اوقات دورانِ مطالعہ میں چشم پر آب ہو جاتا ہوں۔ اس کا اثر میرے دل پر کئی کئی دن رہتا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے۔" (۵۶)

تاریخ اسلام کی چار جلدوں میں کتابی صورت میں اشاعت ہوئی تو اقبال کا یہ تبصرہ اس کتاب کے فلیپ پر چھاپا گیا۔

جاوید اقبال پانچ برس کے ہوئے تو ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ظفر اقبال سے ان کی تعلیم کے بارے میں مشورہ کیا۔ پروفیسر صاحب نے عرض کیا کہ بہتر ہے کہ پہلے چار برس سیکرڈ ہارٹ سکول میں پڑھے تاکہ انگریزی سے اچھی طرح مانوس ہو جائے اور پانچویں جماعت سے اسے سنٹرل ماڈل سکول میں داخل کروا دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ قبول کر لیا۔ انہی دنوں ڈاکٹر صاحب سیالکوٹ سے ہو کر آئے تو بہت پریشان تھے۔ پروفیسر ظفر اقبال کو بلوایا اور فرمانے لگے: بھائی عطا محمد اس بات پر بہت ناراض ہیں کہ جاوید کو عیسائیوں کے سکول میں داخل کروا

دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے عرض کیا: اب انہوں نے غصہ نکال لیا ہے۔ اب آپ خاموش رہیے اور اسے یہیں پڑھنے دیجیے۔ پانچویں جماعت میں اسے سنٹرل ماڈل سکول میں منتقل کروالیں گے۔ انگریزی کی بنیاد یہاں بن جائے گی اور باقی مضامین کے لیے وہاں ٹیوٹر مقرر کر دیں گے۔ چنانچہ یہ منصوبہ اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (۵۷)

حاجی میاں غلام علی رئیس اعظم سیالکوٹ آنریری مجسٹریٹ، صدر انجمن اسلامیہ سیالکوٹ، کمشنر و صدر میونسپل کمیٹی سیالکوٹ، بانی جامع مسجد پل ایک، سیالکوٹ کی معروف شخصیت تھے۔ عمر کے لحاظ سے اپنے بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔۔ ان کی شخصیت گورنمنٹ کے ہاں بھی محترم تھی۔ خاندان میں بھی ان کا بڑا وقار تھا۔ مالی حیثیت اتنی مضبوط تھی کہ سیالکوٹ کے رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ ان کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی زبیدہ بیگم کی شادی پروفیسر ظفر اقبال سے ہوئی۔ (۵۸)

ڈاکٹر سعید اقبال نے اپنے دادا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ فصیح صاحب کے بڑے بھائی میاں غلام علی میرے نانا تھے۔ اس حوالے سے دلچسپ واقعات بھی موجود ہیں جن میں سے اہم واقعہ یہ ہے کہ چونکہ غلام قادر فصیح انگریزوں کے بہت خلاف تھے اور انہوں نے چند کتابیں بھی ملکہ وکٹوریہ اور انگریزوں کے خلاف لکھیں جن کو ضبط کر لیا جاتا۔ بے باک صحافی ہونے اور گورنمنٹ کے خلاف تحریریں چھاپنے پر ان کی کتابیں ضبط کرنے کا اعلان کر دیا جاتا۔ یہ اعلان انگریز حکومت کی طرف سے کروایا جاتا کہ اگر کسی کے پاس یہ کتابیں پائی گئیں تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ میاں غلام علی اس خوف سے کہ فصیح کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ضبطی کے اعلان کے بعد بچی ہوئی کتابیں تندوروں میں پھینکوا دیتے۔ اب چوں کہ غلام قادر فصیح بڑے بھائی کا بہت ادب کرتے تھے اس لیے رو برو تو کچھ نہ کہہ سکتے لیکن محفلوں میں یہ جملہ ضرور کہتے تھے جو بڑا دلچسپ ہے کہ سگ باش برادر خورد مباش (۵۹)

سعیدہ احسن نے اپنے نانا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ:

> ''دادا جی کے بڑے بھائی میاں غلام علی مال دار شخص تھے۔ آدھا سیالکوٹ ان کا تھا لیکن پڑھائی لکھائی سے اتنا شغف نہ تھا جبکہ دادا میں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق

تھا۔''(۶۰)

غلام قادر فصیح کو اپنے بھائی میاں غلام علی سے بہت محبت تھی اور وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔اس کے باوجود خوددار اتنے زیادہ تھے کہ بھائی کی دولت استعمال کرنے کے بجائے اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کیا۔اپنا پرنٹنگ پریس ''پنجاب پریس'' کے نام سے کھولا۔سیالکوٹ میں واحد مسلمان تھے جو پریس کے مالک تھے۔باقی سبھی ہندو تھے۔باقاعدہ پریس صرف انہی کا تھا۔ کتابوں کی فروخت اور پریس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی لیکن چونکہ بے حد کھلے دل کے مالک تھے اس لیے پیسہ جمع کرنا ان کو کبھی نہ آیا۔آخر عمر میں معاملہ قرض پر تھا بلکہ مکان بھی گروی رکھا ہوا تھا۔ظفر اقبال میٹرک کا امتحان دے رہے تھے جب منشی غلام قادر فصیح کا انتقال ہوا۔ڈاکٹر سعید اقبال نے بتایا کہ

''دادا جی، نانا جی سے کہہ گئے کہ ظفر کو پیچھا نہ دکھانا اور دھیان رکھنا''(۶۱)

میاں غلام علی نے بھائی کی اس وصیت کو پوری طرح نبھایا اور فصیح کے مرنے کے بعد ان کے بچوں کی کفالت کا ذمہ اٹھالیا۔اگرچہ باپ کے خوددار خون اور ماں کی غیور طبیعت اور پرورش کی وجہ سے مولوی ظفر اقبال نے اس ماہانہ رقم کو قرض کے طور پر لیا جو غلام علی ہر ماہ ان کو دیا کرتے تھے۔تاہم یہ غلام علی کی بھائی سے محبت اور ان کے بچوں سے شفقت کا احساس تھا کہ جس نے انہیں غافل نہ ہونے دیا۔

غلام علی نے انجمن اسلامیہ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بھی بہت تعاون کیا۔ایم۔یوسف قمر تاریخ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے ابتدائی مخدوش حالات، انجمن کے بانی مولوی شفیع کے انتقال کے بعد کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مایوس کن حالات میں بھی ادارہ کو حاجی میاں غلام علی، آغا محمد باقر خاں اور شیخ محمد رمضان جیسے دردمند اور ذی اثر حضرات کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔''(۶۲)

زکوٰۃ کمیٹی کے ممبران میں بھی حاجی میاں غلام علی شامل تھے۔(۶۳)

۱۹۱۰ء میں حاجی میاں غلام علی انجمن کے صدر تھے۔(۶۴)

اپریل ۱۹۱۴ء کو حاجی میاں غلام علی کو انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔آپ انتہائی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے اور قومی فروغ کے لیے آپ کے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل تھا۔(۶۵)

سید مراد شاہ غلام قادر فصیح کے ملازم تھے اور ان کے پریس کی نگرانی بھی انہی کے ذمے تھی۔ظفر اقبال جب پڑھائی کی عمر کو پہنچے تو ان کے اولین اتالیق سید مراد شاہ ہی مقرر ہوئے۔ان کا کام ظفر اقبال کو اردو اور ریاضی پڑھانا تھا۔اس کے ساتھ ان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ مغرب کی اذان ہوتے ہی ظفر اقبال کو جہاں کہیں اور جس حال میں ہوں فوراً گھر پہنچا دیں۔گویا ظفر اقبال کی عادات سنوارنے میں یہ استاد بھی اُن کے والد کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔حروف شناسی کا ملکہ اور ان کے ٹھیک لکھنے کا سلیقہ پروفیسر ظفر اقبال نے انہی سے سیکھا تھا۔سید مراد شاہ کی اس مہارت کا اندازہ اُس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ظفر اقبال کو اُن کے بیٹے سلیم اقبال کے فضائی حادثے میں جاں بحق ہونے پر تحریر کیا۔''(۶۶)

گھر میں ہر طرح کی آسائش تھی۔بچے بہت ناز و نعمت سے پالے جا رہے تھے۔گھر میں چھ چھ نوکر اور بے شمار اخراجات۔اس کے باوجود فصیح صاحب ان پر سخت نگرانی رکھتے تھے۔لیکن اولاد چونکہ اللہ آمین کی تھی اس لیے زیادہ سختی نہیں ہو پاتی تھی۔خود (ظفر اقبال) بتایا کرتے تھے کہ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی گھریلو ملازم مراد شاہ کو والد صاحب کی طرف سے یہ حکم تھا کہ ظفر جہاں کہیں بھی ہو اسے گھر لے آیا کرو۔''(۶۷)

فصیح صاحب سیاسی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔میدانِ صحافت کے کھلاڑی اور حکومت پر بے لاگ تبصرے کرنے والے تھے۔ان کا قلم رواں تھا اس لیے ان کی تحریریں اور کتابیں کئی دفعہ ضبط ہوئیں۔(۶۸)

رشید نیاز نے ''تاریخ سیالکوٹ'' میں سیاسی شخصیات کے ضمن میں غلام قادر فصیح کا ذکر بڑے بھرپور انداز میں کیا ہے اور فصیح کی شعلہ بیانیوں اور پرتاثیر گفتگو کو بیان کیا ہے۔عنوان اس طرح سے قائم کیا ہے۔

''فخرِ سیالکوٹ جناب منشی غلام قادر فصیح'' (۶۹)

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ غلام قادر فصیح کے سیاسی کارناموں کو بیان کیا ہے۔

''آپ ان عزیز الوجود سیاسی اکابرین میں سے تھے جن پر اہلِ سیالکوٹ ہی نہیں بلکہ اہل پنجاب فخر کرتے ہیں۔ ہم جب آپ کی زندگی پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے ذہن میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آپ کی تربیت کسی زبردست انقلابی ماحول میں ہوئی ہوگی۔ تحریر وتقریر میں آتش بیانی کے ساتھ ساتھ سحر بیانی اور ولولۂ حریت کا گفتار وکردار سے اظہار آپ کی انقلابی طبیعت وماحول کی غمازی کرتے ہیں۔ آپ شروع سے ہی ایسی تحاریک کے علمبردار رہے ہیں جن کا مقصد آزادیٔ ہند ہوتا تھا۔ انگریز کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے کردار سے دشمنی محض اس لیے رہی کہ وہ ہندوستان کے معصوم لوگوں کو اپنے پنجۂ استبداد وغلامی میں دبائے رکھنا چاہتا تھا۔۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی محفل میں بڑے سے بڑا غدار وطن بھی آکر کچھ عرصہ کے لیے آزادی کے فضائل کو جاننے لگ پڑتا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ملک سے غداری کر رہا ہے۔ آپ کے ساتھ چند لمحات مصروفِ گفتگو رہنے کے بعد بڑے سے بڑا بزدل بھی چٹانوں سے ٹکرا جانا سیکھ لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس اجتماع کو بھی آپ نے خطاب کیا وہ کوئی گل کھلائے بغیر نہ رہ سکا۔

قدرت نے ایک خاص قسم کی تاثیر آپ کی زبان میں پیدا کر رکھی تھی۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے ایک اخبار بھی شائع کرنا شروع کیا۔ اس کا نصب العین بھی تحاریک آزادیٔ ہند کو تقویت پہنچانا تھا۔ آخر کار حکومت برطانیہ نے آپ کا پریس اور اخبار دونوں ضبط کر لیے۔ اس کے بعد آپ نے ملکہ وکٹوریہ کے خلاف ایک کتاب تالیف کی جس میں ملکہ کو اس کے اصل روپ میں دکھایا گیا تھا۔ حکومت نے یہ کتاب بھی ضبط کر لی اور ساتھ یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ جس کے پاس یہ کتاب ملے گی اسے ایک سال کی سزا دی جائے گی۔ اخبار اور کتاب کے ضبط ہونے کے بعد آپ کا حوصلہ پست ہونے کی بجائے پوری طاقت سے دوبارہ ابھرا۔ تحریک زمینداری میں آپ نے خوب جوہر دکھائے اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کی۔ آپ پہلے سیاسی بزرگ تھے جنہوں نے دیشی پہنو اور بدیشی چھوڑو کی تحریک کو شروع کیا۔ یہ تحریک اتنی کامیاب ہوئی کہ لوگوں نے اپنی قیمتی سے قیمتی بدیشی کپڑے برسر بازار جلا کر قومی غیرت کا ثبوت پیش کیا۔ آپ خلیفہ نورالدین اور مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص دوستوں میں سے تھے مگر موخر الذکر کے دعویٰ نبوت کے بعد موصوف نے اپنے تعلقات بالکل منقطع کر لیے۔ الغرض آپ سیالکوٹ کے ان مشاہیر میں سے تھے جن کی علمی

اور سیاسی خدمات آسمانِ سیاست پر درخشندہ ستارے کی طرح چمکتی رہیں گی۔'' (۷۰)

رشید نیاز نے غلام قادر فصیح کا بطور سیاسی رہنما تجزیہ کیا ہے اس لیے ان کی معلومات کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے وہ خصوصیات اور مشکلات گنوائی ہیں جو سیاسی میدان سے متعلقہ ہیں۔ ادیب کا تعلق عام قاری سے ہوتا ہے جبکہ سیاسی رہنما کا تعلق حکومت سے براہ راست ہوتا ہے۔ اور پھر حکومت اگر انگریز کی ہو تو ایسے ہی حالات و واقعات پیش آتے ہیں جیسا کہ رشید نیاز نے غلام قادر فصیح کے ضمن میں بیان کیے ہیں۔ اگر ہم ان خصوصیات و مشکلات کو فرداً فرداً بیان کریں تو وہ کچھ اس طرح سے ہوں گی:

1۔ سیاسی رہنما جو اپنی سحر بیانی اور ولولۂ حریت سے انقلاب کے داعی ہیں۔

2۔ ان کی محفل میں آ کر لوگوں کے حوصلے بلند اور حب الوطنی کے جذبے جواں ہو جاتے تھے۔

3۔ پرتاثیر گفتگو فرماتے تھے۔

4۔ حکومتی پالیسی سے تصادم کے نتیجہ میں آپ کا اخبار اور پریس دونوں ضبط کر لیے گئے لیکن آپ کے بڑھتے قدموں میں کوئی فرق نہ آیا۔

5۔ پہلے سیاسی بزرگ ہیں جنہوں نے دیسی پہناوا اور بدیشی چھوڑو تحریک کا آغاز کیا۔

6۔ بلاتعصب ہر فرقے اور مذہب کے لوگوں سے ملتے تھے لیکن مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت کے بعد ان سے تعلقات منقطع کر لیے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کو گنوانے کا مقصد یہ ہے کہ غلام قادر فصیح بیک وقت مترجم، صحافی، ادیب، پرنٹنگ پریس کے مالک، اپنے جاری کردہ رسالوں کے مدیر، تاریخ اسلام کے مولف اور جذبہ حریت رکھنے والے سیاسی رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی ہر ذمہ داری کو بخوبی نبھایا اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی قابلیت کو نکھارا۔ وہ نہ صرف سیالکوٹ کی تاریخ میں بلکہ اردو ادب میں بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

جب سید میر حسن کا نام بطور استاد کے لیا جاتا ہے تو سب کے ذہنوں میں صرف ان کے ایک ہی شاگرد کا نام آتا ہے اور وہ ہے علامہ اقبال۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو اقبال بنانے میں میر حسن جیسے قابل استاد نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست اور اہم ہے کہ میر حسن نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری اور اقبال کے علاوہ

بہت سی نامور شخصیات کو اپنے علم سے فیض بخشا۔ اس مقالے کے موضوع کی شخصیت غلام قادر فصیح کا تعلق اس دور سے ہے جب میر حسن سکاچ مشن سکول میں پڑھاتے تھے۔ میر حسن ۱۸۶۳ء سے ۱۹۲۹ء تک اسی ادارے میں پڑھاتے رہے جس نے پہلے پرائمری سکول پھر ہائی سکول اور آخر کار مرے کالج سیالکوٹ کی صورت میں ترقی کی ۔ غلام قادر فصیح ۱۸۶۰ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک سکاچ مشن سکول سے کیا۔ رشید نیاز نے ''تاریخ سیالکوٹ'' میں میر حسن کا بطور استاد ذکر کرتے ہوئے ان کے چند مشہور شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن میں غلام قادر فصیح بھی شامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''اپنے شاگردوں کے ساتھ خاص شفقت اور الفت سے پیش آتے۔ ان کے دولت کدے پر مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی شاگردوں کا ہر وقت اجتماع رہتا۔ ویسے تو آپ کے شاگردوں کی تعداد لاتعداد ہے مگر جو زیادہ مشہور ہیں وہ تحریر کیے جا رہے ہیں۔
>
> حضرت علامہ اقبال مرحوم، حضرت مولانا محمد ابراہیم میر، منشی غلام قادر، مولانا احمد دین، جناب امین حزیں سیالکوٹی، مولانا ظفر اقبال پی۔ ای۔ ایس۔ ریٹائرڈ، جناب فیض احمد فیض چیف ایڈیٹر پاکستان ٹائمز، جناب عبدالقیوم پی۔ ای۔ ایس ریٹائرڈ، جسٹس کنور سین، سردار کھڑک سنگھ، سردار حضورا سنگھ، سردار گنڈا سنگھ، پنڈت بیلی رام وکیل، لالہ نرنجن داس تیج، اقبال سنگھ ڈپٹی کمشنر، چڑت سنگھ ڈسٹرکٹ جج، ڈاکٹر جمشید علی راٹھور، جناب آغا صفدر، جناب پروفیسر محمد دین بھٹی وغیرھم۔'' (۱۷)

اسی طرح ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ''روایات اقبال'' میں مولوی میر حسن کے جن شاگردوں کا ذکر کیا ہے ان میں فصیح کا نام بھی شامل ہے۔

''مولوی میر حسن صاحب سے ہر طبقے کے لوگ مبتدی اور منتہی فائدہ اٹھاتے تھے۔ کئی فارغ التحصیل بھی مستفید ہوتے تھے۔ لالہ نرنجن داس سب جج (پہلے ہیڈ ماسٹر تھے)، سردار حضورا سنگھ وکیل، پنڈت بیلی رام وکیل (یہ بھی شاعر تھے)، مولوی احمد دین صاحب ریڈر اور ان کے فرزند منشی محمد مسیح پال (امین حزیں سیالکوٹی)، مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی، منشی غلام قادر فصیح مرحوم، سردار کھڑک سنگھ مشہور سکھ لیڈر، شیخ ظہور الدین صاحب تحصیل دار، سردار چڑت سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ جج (ریٹائرڈ)، پروفیسر محمد امین صاحب ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، جسٹس کنور سین پرنسپل لا کالج، مولوی ظفر اقبال صاحب ایم۔اے، پی۔ای۔ایس ریٹائرڈ، لالہ بھیم سین، عبدالقیوم میر ایم۔اے، ایم۔او۔ایل۔پی۔ای۔ایس ریٹائرڈ، شیخ نور الٰہی صاحب وکیل سبھی ان سے علمی فوائد حاصل کرتے تھے۔'' (۷۲)

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے میر حسن کے تلامذہ میں غلام قادر فصیح کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے بارے میں درج ذیل تفصیلات فراہم کی ہیں:

''مولوی ظفر اقبال کے والد ماجد ہیں۔ سیالکوٹ شہر میں محلّہ کمہاراں سے متصل سرکلر روڈ پر ان کا اردو پریس ''پنجاب پریس'' تھا۔ ہفتہ وار اخبار ''پنجاب گزٹ'' اور ماہوار رسالہ ''پنجاب جرنل'' شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فصیح صاحب نے اپنی کئی کتابیں اس مطبع سے شائع کیں۔ سکاچ مشن سکول کے تعلیم یافتہ تھے۔ میر صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔ تاریخ اسلام چار جلدوں میں لکھی۔ فصیح صاحب نے ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ میر حسن کی ترغیب پر فصیح

صاحب نے فرانسیسی ناول نگار الیگزنڈر ڈما کے ناول
"The Count of Montecristo" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔''(۷۳)

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے میر حسن کے حیات وافکار پر جو کتاب لکھی ہے اس میں ان کے شاگردوں کے عربی فارسی ذوق کے حوالے سے میر حسن کی خدمات بیان کی ہیں۔ اس حوالہ میں غلام قادر فصیح کا نام بھی شامل ہے۔

''میر صاحب عام اساتذہ کی طرح شاگردوں کو محض سبق رٹانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال کے علاوہ ان کے بیسیوں شاگرد ایسے ہیں جو عربی اور فارسی کا صحیح ذوق رکھتے تھے اور جو عربی اور فارسی صحیح سمجھ سکتے تھے، بول سکتے تھے اور پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے صرف اقبال کو ان کا شاگرد کہہ کر ہم بات ختم نہیں کر سکتے۔ اقبال کے علاوہ مولوی ظفر اقبال، کنور سین، ڈاکٹر محمد جمشید علی راٹھور، محمد ابراہیم میر، غلام قادر فصیح اور امین حزین وغیرہ کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔''(۷۴)

سیالکوٹ کی انجمن اسلامیہ کے ابتدائی اجلاس کے ذکر میں میر حسن کے ساتھ ساتھ غلام قادر فصیح کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ سلطان محمود لکھتے ہیں کہ میر حسن گوجرانوالہ سے سیالکوٹ میں مستقل طور پر آ گئے تھے۔ طبابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ یہ ۱۹۰۲ء کا زمانہ تھا۔ محلہ خراسیاں میں ایک پرائمری مدرسہ اور یتیم خانہ کی طرح ڈالی۔ مدرسہ کا نام مدرسۃ القرآن تھا۔ مولوی صاحب مارچ ۱۹۰۶ء کے طاعون میں چل بسے۔ مدرسۃ القرآن اور یتیم خانہ کو وسیع بنیادوں پر چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی ۱۹۰۷ء میں قائم کی گئی۔ مولوی محمد ابراہیم میر جو میر حسن کے شاگرد تھے۔ سیالکوٹ کی انجمن تائید الاسلام کے بانی تھے۔ ان کی تحریک پر ۲۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو انجمن تائید الاسلام، انجمن مدرسۃ القرآن اور انجمن شان المسلمین کو یکجا کر کے انجمن اسلامیہ کی بنا ڈالی گئی۔ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کا پہلا اجلاس ۳ دسمبر ۱۹۱۱ء کو انجمن کی مسجد میں مرزا بدرالدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۷ فروری ۱۹۱۲ء کے اجلاس میں تین اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو انجمن کے آئندہ طریق کار اور قواعد کے متعلق ایک مسودہ ماہِ رواں کی ۲۵ تاریخ تک پیش کرے۔ میر حسن بھی ان میں شامل تھے۔۔ دوسرے ارکان چودھری محمد خان اور غلام قادر فصیح تھے۔''(۷۵)

آخری ایام:

ایک دفعہ گوجرانوالہ کسی بارات میں شمولیت کے لیے گئے ۔ صاحب خانہ نے چھت کے اوپر کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چھت پر آرام کے لیے لیٹ گئے ۔ اتفاق سے چھت سے نیچے گر پڑے اور پنڈلی ٹوٹ گئی ۔ اسی وقت مولوی محمد علی کو تار دیا گیا۔ مولوی صاحب پہنچے تو فصیح صاحب کو لے کر گجرات کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جب تکلیف رفع نہ ہوئی تو سیالکوٹ لائے اور مشہور جراح میراں بخش کے علاج سے یہ عارضہ جاتا رہا۔

انہی دنوں ذیابیطس کی بیماری لاحق ہو گئی تھی ۔ کاربنکل بھی نمودار ہو گیا۔ دھاروال ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے پہلا آپریشن کیا لیکن مرض میں افاقہ نہیں ہوا۔ پھر دوسرا آپریشن سول ہسپتال سے کرایا گیا، یہاں بھی آرام نہیں ہوا۔ اس طرح ڈاکٹر کشن چند نے تیسرا آپریشن کیا لیکن فصیح صاحب صحت یاب نہ ہو سکے ۔ میاں برکت علی، حاجی امیر علی اور حاجی نتھو رات دن تیمارداری میں مصروف رہے۔ آخری لمحات میں فالج نے بھی حملہ کر دیا۔ لالہ امر داس، ڈاکٹر کشن چند نے پوری توجہ سے علاج کیا لیکن فصیح صاحب کی زندگی کے سانس پورے ہو چکے تھے ۔ پھر ایک لمحہ ان کی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہوا۔ انہیں بابل شہید کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (۷۶)

غلام قادر فصیح نے زیادہ عمر نہیں پائی ۔ باون برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء کو فوت ہو گئے ۔ ان کی وفات کی خبر ماہنامہ ادیب میں شائع ہوئی:

''شیخ غلام محمد کے بعد غلام قادر فصیح

اخبار وکیل کے نامور پروپرائٹر شیخ غلام صاحب کی وفات کا غم ابھی تازہ تھا کہ ایک اور چرکہ لگا یعنی منشی غلام قادر فصیح سیالکوٹی نے گزشتہ ماہ کے آخر میں بعارضہ کاربنکل انتقال کیا ۔ آپ کی عمر اڑتالیس سال تھی ۔ آپ پرانے اخبار نویس اور بڑے مشاق مترجم تھے ۔ کچھ عرصہ امپیریل پیپر کے ایڈیٹر رہنے کے بعد انھوں نے سیالکوٹ سے ''پنجاب گزٹ'' نامی ایک اخبار نکالا جو کئی سال تک جاری رہا۔ عرصہ تک ایک ماہوار رسالہ ناولسٹ بھی نکالتے رہے ۔ اب آخر میں تاریخ اسلام کے نام سے سلسلۂ کتب شروع کیا تھا۔ پندرہ سال تک سیالکوٹ کی میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے ۔ اور

اس کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے ۔ خداوند آپ کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔''(۷۷)

منشی غلام قادر فصیح اپنے دور کے ایک قابل شخص تھے۔ وہ عربی و فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ میر حسن کے خاص نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ صحافت میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ پریس کے مالک بھی تھے۔ مورخ اسلام کے طور پر بھی ان کا نام آتا ہے جس کا اعتراف علامہ اقبال نے خط کے ذریعے کیا۔ مترجم کی حیثیت سے اردو ادب میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی کامیاب سیاسی رہنما کے طور پر ابھرے۔ اس ہمہ جہت شخصیت کی محفلوں میں موجودگی و نمائندگی اور بلا تعصب ایک وسیع حلقۂ احباب رکھنا فصیح کی شخصیت کے ہر دلعزیز اور نامور ہونے کی دلیل بھی ہے اور اس بات کا عکاس بھی ہے کہ وہ دور جب سیالکوٹ علمی و ادبی حوالے سے ایک روشن مثال تھا اس کی بنیادوں میں غلام قادر فصیح کے کارنامے بھی شامل ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارنامے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔

باب اول

حوالہ جات

۱۔ ایم۔ یوسف قمر، چونسٹھ سالہ تاریخ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ، سیالکوٹ: شعبہ نشر و اشاعت انجمن اسلامیہ (رجسٹرڈ) سیالکوٹ ۱۹۶۶ء، ص ۳، ۴

۲۔ رشید نیاز، تاریخ سیالکوٹ، سیالکوٹ: مکتبہ نیاز، ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۸

۳۔ محترمہ سعیدہ احسن، غلام قادر فصیح کی پوتی اور مولوی ظفر اقبال کی بیٹی ہیں۔ ان سے ایک ملاقات کے دوران مقالہ نگار کی گفتگو

۴۔ محمد صادق، منشی غلام قادر فصیح، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱

۵۔ایضاً،ص۲

۶۔روایت حاجی امیر علی بحوالہ مقالہ منشی غلام قادر فصیح،ص۲،۳

۷۔ایضاً،ص۴،۵

۸۔ایضاً،ص۳،۴

۹۔ایضاً،ص۵

۱۰۔ایضاً

۱۱۔ایضاً،ص۶

۱۲۔راوی مولوی ظفر اقبال بن غلام قادر فصیح بحوالہ مقالہ ص۸

۱۳۔ایضاً،ص۹

۱۴۔ایضاً

۱۵۔ایضاً

۱۶۔ایضاً،ص۱۰

۱۷۔راوی حاجی امیر علی بحوالہ مقالہ منشی غلام قادر فصیح،ص۱۱

۱۸۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی، پنجاب میں اردو صحافت، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء، ص۶۰۶

۱۹۔امداد صابری، تاریخ صحافت جلد سوم، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس ۲۲ گلی کبابیاں جامع مسجد، ۱۹۶۳ء، ص۵۶۱

۲۰۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات اور رسائل ۱۹۴۷ء تک، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص۴۷

۲۱۔محترمہ سعیدہ اقبال سے اُن کی رہائش گاہ پر ایک ملاقات کے دوران میں کی گئی گفتگو

۲۲۔روایت سعیدہ اقبال بحوالہ مقالہ مولانا ظفر اقبال۔حیات و خدمات، مقالہ برائے ایم۔اے اسلامیات، مقالہ نگار عروبہ سعید قریشی، مملوکہ ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور ۱۹۹۶ء، ص۸۶

۲۳۔ابوالقاسم رفیق دلاوری، رئیس قادیان، ۱۹۳۸ء، ص۱۹۴۔۱۹۷، بحوالہ مقالہ ظفر اقبال، ص

۲۳،۲۲

۲۴۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، شمس العلماء مولوی سید میر حسن۔ حیات و افکار، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۱ء، ص ۹۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۷۔ ڈاکٹر سعید اقبال، مولوی ظفر اقبال کے بیٹے اور غلام قادر فصیح کے پوتے ہیں۔ ان سے ایک نشست کے دوران میں حاصل کی گئی معلومات

۲۸۔ ڈاکٹر سعید اقبال اور مسز سعید اقبال سے مقالہ نگار کی گفتگو

۲۹۔ مولوی ظفر اقبال کی بیٹی مسز سعیدہ احسن سے گفتگو

۳۰۔ ڈاکٹر سعید اقبال سے گفتگو

۳۱۔ مقالہ ظفر اقبال۔ حیات و خدمات، ص ۲۶

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۶، ۲۷

۳۵۔ بروایت جناب نذیر احمد بحوالہ مقالہ مولانا ظفر اقبال، ص ۳۳

۳۶۔ یہ باتیں پروفیسر ظفر اقبال کی ان تحریروں سے ثابت ہیں جو ان کے پرانے کاغذات میں درج ہیں۔

۳۷۔ مسز سعیدہ اقبال سے گفتگو

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ مقالہ ظفر اقبال، ص ۸۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۸۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۰۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۴۔ایضاً،ص۳۲

۴۵۔ایضاً،ص۳۲،۳۳

۴۶۔ڈاکٹر سعید اقبال سے ملاقات کے دوران کی گئی گفتگو۔انہوں نے وہ قرآن پاک کھول کر مجھے دکھایا جس کی کتابت اور نفیس کاغذ اس کے تیار کرنے اور لکھنے والے کی عقیدت اور جذبوں کا عکاس تھا۔

۴۷۔ڈاکٹر سعید اقبال سے گفتگو

۴۸۔نقوش،لاہور نمبر ص۱۰۵۴

۴۹۔مقالہ ظفر اقبال،ص۳۱۲

۵۰۔مقالہ غلام قادر فصیح،ص۱۶

۵۱۔عفت اقبال سے ملاقات

۵۲۔ڈاکٹر سعید اقبال سے مقالہ نگار کی گفتگو

۵۳۔ایضاً

۵۴۔مقالہ ظفر اقبال،ص۱۰۳

۵۵۔سید نذیر نیازی،دانائے راز،لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۸۸ء،ص۲۲۷

۵۶۔شیخ عطاء اللہ،اقبال نامہ حصہ دوم،لاہور:شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار،۱۹۵۱ء،ص ۲۶۴،۲۶۳

۵۷۔روایت میر عبدالجلیل بحوالہ مقالہ ظفر اقبال،ص۸۴

۵۸۔مقالہ ظفر اقبال،ص۲۰

۵۹۔ڈاکٹر سعید اقبال سے گفتگو

۶۰۔محترمہ سعیدہ احسن سے ملاقات کے دوران کی گئی گفتگو

۶۱۔ڈاکٹر سعید اقبال سے کی گئی گفتگو

۶۲۔ایم۔یوسف قمر،چونسٹھ سالہ تاریخ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ،ص۱۴

۶۳۔ایضاً،ص۱۶

۶۴۔ایضاً،ص۱۸

۶۵۔ایضاً،ص۲۶

۶۶۔مقالہ ظفر اقبال،ص۵۳

۶۷۔ایضاً،ص۳۱

۶۸۔ایضاً،ص۲۱

۶۹۔رشید نیاز،تاریخ سیالکوٹ،ص۲۳۲

۷۰۔ایضاً،ص۲۳۲،۲۳۳

۷۱۔ایضاً،ص۱۰۲

۷۲۔ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی،روایاتِ اقبال،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۷۷ء،ص۱۹۵،۱۹۶

۷۳۔ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین،شمس العلماء مولوی سید میر حسن۔حیات وافکار،لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۸۱ء،ص۲۱۰

۷۴۔ ایضاً،ص۵۶

۷۵۔ایضاً،ص۶۰،۶۱

۷۶۔ منشی غلام قادر فصیح،مقالہ ایم۔اے اردو،ص۱۶

۷۷۔ماہنامہ ''ادیب'' الہ آباد،مئی۱۹۱۲ء،خدا بخش لائبریری پٹنہ جرنل جلد۷،۸،ص۳۳۵

۷۸۔شجرہ نسب بحوالہ مقالہ ''مولانا ظفر اقبال۔حیات وخدمات'' برائے ایم۔اے اسلامیات، مقالہ نگار عروبہ سعید قریشی،مملوکہ ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور،۱۹۹۶ء، ص۲۹

باب دوم

غلام قادر فصیح کی تصانیف کا جائزہ

دبستانِ لاہور اردو ادب میں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اہم مقام کا حامل ہے۔ اس حوالے سے چند نام ایسے ہیں جو اپنے دور کے معروف ادیب اور اخبار نویس تھے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں ان پر کوئی جامع اور مبسوط تبصرہ نہیں ملتا۔ اس فہرست میں غلام قادر فصیح کا نام سرِ فہرست ہے۔

غلام قادر فصیح جامع صفات اور جامع الحیثیات تھے۔ وہ بیک وقت سیاسی رہنما، مترجم، مصنف، مؤرخ اسلام، صحافی اور پریس کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف و تالیفات کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

تراجم:

برگنڈی کی شہزادی

اس ناول میں فرانس کے صوبے برگنڈی کے ڈیوک رابرٹ کی بیٹی شہزادی بلانچی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ فرانچی کامتی کا کونٹ گریگوری اس سے شادی کر کے برگنڈی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس ناول کے کل ۱۴۴ صفحات اور ۱۸ ابواب ہیں۔ پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۴ء کو شائع ہوا۔ ۱۸۹۵ء کے پنجاب گزٹ میں کتابوں کی فہرست میں اس ناول کا ذکر بھی موجود ہے اور ریمارکس کے عنوان کے تحت درج ذیل بیان دیا گیا ہے۔

"Translation of an English novel

narrating a story of a princess of

France whom a count wanted to marry

against her will."(۱)

ناول کی ابتداء میں برگنڈی اور رابرٹ کے قلعے کا ذکر کیا گیا ہے:

''ہمارے فسانہ کا زمانہ تیرھویں صدی ہے اور نظارہ صوبہ برگنڈی ہے ۔۔۔رابرٹ ڈیوک آف برگنڈی اس بات کا فخر کیا کرتا تھا کہ کوئی انسانی دشمن اس قلعہ کو فتح نہیں کر سکتا تھا۔اور اس کا فخر بجا تھا۔کچھ بے جا نہیں تھا۔''(۲)

بلانچی ڈیوک رابرٹ کی اکلوتی بیٹی تھی۔صوبہ فرانچی کومتی کے کونٹ گریگوری نے بلانچی سے شادیٔ کی پیش کش رابرٹ کو کی تھی۔وہ برگنڈی میں اپنے امراء وشرفا کے ہمراہ آیا۔وہ چالیس سالہ تیز طرار شخص تھا۔

''گو بجائے شہزادہ معلوم ہونے کے وہ قزاقوں کا سردار معلوم پڑتا تھا۔گو اس نے ارغوانی اور باریک لینن کی پوشاک پہنی ہوئی تھی اور اس پر سنہری اور جواہرات کی مرصع کاری ہو رہی تھی تاہم وہ دربار کے لائق بنا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا جو ایسے میزبان کے شان کے شایان ہو۔''(۳)

شہزادی نے بھی حسب دستور اس سے ملاقات کی لیکن پہلی نظر پڑتے ہی وہ اس کی شکل وصورت اور اوصاف کو تاڑ گئی تاہم حق میزبانی ادا کرتے ہوئے وہ اس سے خوش دلی سے ملی۔

''کالی آنکھیں اوسے کھانے کو دوڑتی معلوم ہوتی تھیں اور اس شخص کی نظر اوسے نہایت تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔''(۴)

رابرٹ نے اس کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اکیلا برگنڈی کا حاکم نہیں بن سکتا تاہم ان دونوں کا بیٹا اس صوبہ کا ڈیوک ہوگا۔کونٹ نے کوئی بھی شرط ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی نیت میں فتور تھا۔یوسٹیس نے شہزادی سے اظہار محبت کیا جسے ڈیوک نے سن لیا لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔اگلے دن وہ یوسٹیس اور چند ہمراہیوں کو لے کر ڈجن گیا جہاں سے اس نے سونا لے کر اپنے ہمراہ آنا تھا۔قدیمی ملازم اتھلٹین نے طوفان کی پیشین گوئی کی اور کہا کہ وہ

ڈجن میں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ واپسی پر شام ہوگئی اور طوفان آ گیا۔ ڈیوک رابرٹ نے اکیلے ہی واپس جانے کا ارادہ کیا اور یوسٹیس سے کہا کہ وہ بعد میں آرام سے سونا لے کر واپس آ جائے۔ ادھر جب کونٹ کو پتا چلا تو اس نے راستے ہی میں ڈیوک کا کام تمام کرنے کا منصوبہ بنایا۔

''وہ ایسا زمانہ تھا کہ جس کے اوپر یہ مثل صادق آتی ہے
جس کی لاٹھی اس کی بھینس ۔۔۔اس زمانے کے بادشاہ
شہزادے بھی لٹیروں اور ڈاکوؤں سے کوئی زیادہ وقعت
نہیں رکھتے تھے۔''(۵)

ڈیوک کو مار کر انہوں نے نعش کو دریا میں بہا دیا۔ یوسٹیس اور دیگر کو لا کر قید کر دیا۔ شہزادی سے کہا کہ اس کے باپ کو یوسٹیس نے مارا ہے۔

''ہمارے قلم میں یارا نہیں کہ بلانچی کا جو حال ہوا اسے
صفحۂ قرطاس پر قلم بند کر سکیں۔''(۶)

اس کے بعد شہزادی کی فراست کا بیان ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب صوبے کا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا ہے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ برگنڈی کی ملکہ ہے۔ اس کی خادمہ ڈروزل نے اپنی عقل مندی سے اصل صورت حال شہزادی کو سمجھائی اور گریگوری کے لالچ اور اصلیت کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسی اثنا میں سینٹ برنرڈ خفیہ راستے سے اندر آ گیا جو ہال کمرے سے خانقاہ کو جاتا تھا اور جس کا علم ڈیوک اور ایک آدھ پرانے ملازم کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس نے شہزادی کو تسلی دی اور اسی راستے سے باہر نکل گیا۔ اتھلٹین خفیہ راستے سے فرار ہو کر جا رہا تھا کہ اسے سرخ صلیب والا نقاب پوش نظر آیا۔ اس نے دیگر قیدیوں کو بھی رہا کروالیا۔

گریگوری کو شک ہوا تو اس نے شہزادی اور اس کی ساتھی ڈروزل کو قلعہ بسنکن میں قید کر دیا۔ کونٹ شہزادی کے پاس گیا اور اسے شادی کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کی۔

''جب تک تو فرانچی کومتی کی کونٹس نہ بنے گی تب تک
تجھے اس قلعے سے نکلنے کی راہ نہیں ملے گی۔''(۷)

اس مایوسی بھرے وقت میں سرخ صلیب والا کونٹ شہزادی کے پاس آیا اور اسے تسلی دی کہ کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ شادی والے دن آرک بشپ نے نکاح کی رسومات ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن گریگوری شہزادی بلانچی کو لے کر گرجا میں گیا جہاں اس نے شادی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ فادر بکولس وہاں کا پادری تھا۔ رسومات شروع ہونے لگی تھیں کہ معلوم ہوا کہ ایک نقاب دار نائٹ کئی سپاہی لے کر قلعے کے پاس آ گیا ہے۔ ان سپاہیوں نے فوراً تمام انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس وقت ریڈ کراس کے نائٹ نے اپنا نقاب گریگوری کے سامنے اتارا تو وہ دم بخود رہ گیا کیوں کہ وہ ڈیوک رابرٹ تھا جسے اس نے اپنے تئیں قتل کر کے دریا میں پھینکوا دیا تھا۔ رابرٹ نے بتایا کہ اس دن قتل ہونے والا وہ نہیں تھا بلکہ ایک کوہستانی راہزن تھا جس نے ڈیوک کو زخمی کر کے اس کا لباس پہن لیا تھا اور وہ ڈیوک کے دھوکے میں مارا گیا۔ گرجا کے فیصلے کے مطابق گریگوری کو پانچ ہزار آدمیوں کی فوج دے کر ترکوں کے ساتھ فلسطین میں لڑنے کا حکم دیا گیا جہاں وہ جنگ کے دوران مارا گیا۔۔ یوسٹیس نے بھی رابرٹ سے جنگ پر جانے کی اجازت مانگی لیکن رابرٹ خود محاذ جنگ پر گیا اور یوسٹیس اور بلانچی کو برگنڈی کا حکمران مقرر کر دیا۔ اس ناول کے آخر میں یہ پیرا درج کیا گیا ہے:

> ''تواریخ میں لکھا ہے کہ جب یوروپ کی ریاستوں میں ہنگامے اور فساد اور ظلم و ستم ہو رہا تھا برگنڈی کی ریاست میں جس میں یوسٹیس اور بلانچی حکمران تھے امن و ماں رہا اور گو ساتویں جنگ مقدس میں عیسائیوں کو زک پہنچی اور خاص کر فرانس کو سخت نقصان پہنچا تاہم یہ صوبہ نہایت ترقی پر اور اقبال مند رہا۔ حتیٰ کہ فرانچی کامتی کو اپنے صوبہ کے ساتھ شامل کر کے بلانچی اور یوسٹیس نے اس پر بھی حکمرانی کی۔''(۸)

داستان کے خاتمے کا اعلان حق کی فتح اور باطل کی سزا پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''تاریخ میں آفتاب چڑھ آیا ہے۔ صادقوں نے اپنی صداقت کا اجر پایا۔ شریر دل نے اپنی شرارت کا مزہ چکھا اور

داستان ختم ہوئی۔''(۹)

بشابر کھشا یعنی زہریلا درخت

یہ ناول ۹۴ صفحات اور ۴۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ میں غلام قادر فصیح کے اہتمام سے چھپا۔ خواجہ عبدالوحید اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ بنگالی ناول کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ایک مالدار زمیندار جس کی بیوی نہایت فرمانبردار تھی کسی بیوہ کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور طرح طرح کے مصائب و آلام کا شکار ہوتا ہے۔(۱۰)

پہلا باب ''نگیندر کا سفر'' کے عنوان سے ہے۔ نگیندر ہری پور کا ایک کھاتا پیتا خوشحال زمیندار تھا۔ نگیندر کشتی پر سوار ہو کر کلکتہ جا رہا تھا۔ اس کا مقصد وہاں کے مقدمات کو نمٹانا تھا۔ سفر کے پہلے دو دن بخیریت گزر گئے۔ تیسرے دن دریا میں طوفان اٹھا۔ وہ اپنی بیوی سورج مکھی کی ہدایت کے پیش نظر کنارے پر اتر گیا۔ وہ کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اسے ایک ویران مکان میں ایک بوڑھا اور ایک نوجوان لڑکی نظر آئے۔ بوڑھا بیمار اور قریب المرگ تھا۔ نگیندر کے دیکھتے دیکھتے بوڑھے نے آخری سانسیں لیں۔ وہ دبے پاؤں وہاں سے نکل گیا۔ اس کی بیٹی کندا نندنی سمجھی کہ باپ سو رہا ہے۔ وہ بھی سو گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی ماں آسمان سے اتری اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ کندا نے انکار کر دیا تو ماں بہت رنجیدہ ہوئی کہ تم ایک دن خود دنیا کی مصیبتوں سے تنگ آ کر اس دنیا کو چھوڑنے کی آرزو کرو گی۔ اس وقت مجھے بلانا میں تجھے آ کر لے جاؤں گی۔ علاوہ ازیں اس کی ماں نے اسے آسمان پر دو صورتیں دکھائیں جن سے اسے خبردار رہنے کو کہا تھا کہ یہ تمہارے لیے غم و آلام کا سبب ہوں گے۔ ان میں ایک خوبصورت مرد اور ایک سانولی خوبصورت آنکھوں والی نوجوان عورت تھی۔ خوف سے کندا کی آنکھ کھل گئی۔

نگیندر قریبی گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے ایک آدمی کو روپیہ دیا تا کہ وہ بوڑھے کی لاش جلانے کا بندوبست کرے۔ اس شخص کی نوجوان لڑکی چمپا نے کندا کو تسلی دی۔ نگیندر نے گاؤں

کے لوگوں سے کہا کہ وہ کندا کی کفالت اپنے ذمے لے لیں لیکن کوئی تیار نہ ہوا۔ آخر ایک شخص نے تجویز دی کہ کلکتہ میں کندا کی خالہ رہتی ہے۔ وہ اسے اس کے پاس چھوڑ دے۔ چارو ناچار نگیندر کندا کے پاس گیا اور اسے ہمراہ چلنے کو کہا۔ کندا اسے دیکھ کر خوف و دہشت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی کیوں کہ اس کا چہرہ خواب والے جوان جیسا تھا۔ بہر حال نگیندر اسے کلکتہ لے آیا لیکن اس کی خالہ کا کوئی پتا نہ چلا تو وہ اسے اپنی بہن کمل ہانی کے پاس لے گیا جو اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ نگیندر نے سورج مکھی کو خط لکھ کر تمام صورت حال بتائی۔ سورج مکھی نے جواباً تحریر کیا کہ وہ اسے لے کر ہری پور واپس آجائے۔ وہ اس کا خیال رکھے گی اور اس کی شادی کسی اچھے آدمی کے ساتھ کر دے گی۔

نگیندر کندا کو اپنے ساتھ لے گیا جہاں سورج مکھی کی ملازمہ ہیرا کو دیکھ کر کندا ایک مرتبہ پھر دہشت سے سُن ہو گئی کیونکہ اس کا چہرہ خواب والی لڑکی جیسا تھا۔ سورج مکھی نے کندا کا بہنوں کی طرح خیال رکھا اور اپنے منہ بولے بھائی تاراچند سے اس کی شادی کر دی۔ تاراچند کے دوست دبندر نے اسے دیکھا تو وہ اس پر عاشق ہو گیا۔ بدقسمتی سے شادی کے تین سال بعد مسلسل بخار سے تاراچند چل بسا اور کندا بیوہ ہو کر پھر سورج مکھی کے پاس آ گئی۔ دبندر ہری داس بشنو کا بھیس بنا کر سورج مکھی کے گھر گیا اور خواتین کو بہت سے گانے سنائے۔ وہاں اس نے کندا کو دیکھا اور اس سے باتیں بھی کیں۔ ہیرا کو اس پر شک ہو گیا اور وہ اس کا بھید لگانے اس کے پیچھے گئی۔ شراب کے نشے میں دبندر نے اقرار کر لیا کہ وہ کندا کے لیے وہاں وشنو کے بھیس میں جاتا ہے۔ ہیرا حسد سے جل بھن گئی۔

سورج مکھی کو نگیندر کی خاموشی اور غیر معمولی حرکتوں سے شبہ ہوا اور اس نے نگیندر سے پوچھا تو اس نے اقرار کر لیا کہ وہ کندا کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ کندا اس صورت حال میں ہیرا کے مشورے پر اس کے گھر چلی گئی۔ دبندر نے ہیرا سے کہا کہ وہ کندا سے اسے ملوا دے۔ ہیرا نے انکار کر دیا کیوں کہ وہ خود دبندر سے محبت کرنے لگی تھی۔ ایک دن کندا نگیندر کو چوری چھپے دیکھنے اس کے گھر گئی تو وہاں سورج مکھی نے اسے دیکھ لیا۔ سورج مکھی نے دونوں کی شادی کروا دی اور خود گھر سے بتائے بغیر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نگیندر کو اس کی قدر ہوئی۔ وہ کندا کو گھر میں چھوڑ کر خود اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اس نے اپنی ساری

جائیداد کمل ہانی، اس کے بیٹے اور شوہر کے نام کرنے کا ارادہ کیا اور ان کو ساتھ لیے ہری پور آ گیا۔ اسی رات سورج مکھی کو اس نے اپنے کمرے میں دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اسی رات کندا کی ماں پھر خواب میں آئی اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس بار کندا تیار ہو گئی۔ وہ جاگی تو ہیرا نے اسے زہر کی شیشی دی جو کہ اس نے ایسے ہی کسی موقعے کے لیے ایک حکیم سے لی تھی۔ کندا نے وہ زہر کھا لیا۔ ہیرا اپنے پریمی دبندر کے پاس گئی لیکن اس نے اسے دھتکار دیا۔ آخر کار وہ پاگل ہو گئی۔ دبندر بھی شراب نوشی کی کثرت سے بیمار رہ کر مر گیا۔

اس ناول میں اخلاق، تجسس اور حسن و عشق موجود ہے۔ کہانی کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف بیانات دیے گئے ہیں۔ واقعات سے اخذ شدہ اخلاقیات سے بھی گاہے گاہے قارئین کو آگاہ کیا گیا ہے۔ مثلاً کندا کے بیوہ ہونے پر چھٹے باب کے آخر میں یہ بیان ہے:

''بے شک ناظرین ناخوش ہوئے ہوں گے مگر حقیقت
یہ ہے کہ قصہ ابھی شروع ہوا ہے اور زہریلے درخت کا ابھی
تک صرف بیج بویا گیا ہے۔(۱۱)

۲۲ واں باب ''زہریلا درخت کیا ہے؟'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں زہریلے درخت کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ ہر ایک گھر میں پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے دل میں غصہ، حسد اور خواہش کا جوش نہ اٹھے۔ وہ لوگ جو ان پر غالب آ جاتے ہیں وہی بڑے آدمی کہلاتے ہیں مگر جن کو یہ طاقت حاصل نہیں ہوتی وہاں زہریلا درخت اگنا شروع ہو جاتا ہے۔

''سلف کنٹرول (اپنے آپ پر قادر ہونا) کی عدم
موجودگی اس زہریلے درخت کا تخم ہے۔''(۱۲)

نگیندر کے حوالے سے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ نگیندر کے پاس مال و دولت، خدمت گار نوکر چاکر، ہنسی خوشی زندگی سب کچھ موجود تھا۔ اسے اس قدر خوشی میسر نہ ہوتی تو وہ اتنے رنج میں نہ پڑتا۔ وہ رنج سے ناواقف تھا اس لیے ضبط سے بھی ناواقف رہا۔ انتہا درجے کی خوشی اکثر رنج کا باعث ہوتی ہے۔ اس نے اپنے آپ پر ضبط نہ کیا اور ایک اچھی نیک بی بی ہونے کے باوجود کندا کو حاصل کرنے کی خواہش پر ضبط نہ کر سکا اور سورج مکھی، کندا اور اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال دیا۔ کندا کو تو آخر میں زہر کھا کر اس دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔

اس ناول کا مقصد اپنے آپ پر ضبط کرنا اور حسد سے دور رہنے کی اخلاقیات ہے۔ ہم اپنی خواہشات پر ضبط کر کے اور حسد سے دور رہ کر ہی زہریلے درخت کے پھل سے دور رہ سکتے ہیں ورنہ ہم اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی مشکلات کا شکار کر دیتے ہیں۔

ہیبت ناک کارلس

یہ ناول ہسپانیہ کے دارالخلافہ میڈرڈ کے ایک شخص ہیبت ناک کارلس کی لڑائیوں اور معرکوں کا بیان ہے۔ پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۷ء میں چھپا۔ اس کے ۵۷ باب ہیں اور کل ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ناول کے آغاز میں کانڈی ایسپی نوسا اور ڈانا از بلا کو گھر کے سامنے برقعہ پوش سواروں نے پکڑ لیا۔ ایک برقعہ پوش نے ایک خوبصورت لڑکی کو سامنے کیا اور کونٹ کے تینوں بیٹوں پر فردِ جرم عائد کی کہ ان تینوں نے اس لڑکی کی سخت ہتک کی ہے۔ کونٹ کی بیوی نے منت سماجت کی لیکن برقعہ پوش پر اثر نہ ہوا اس نے تینوں کو مار دیا اور ان کی لاش جلانے کو کہا۔

کونٹ وہاں سے بادشاہ فلپ کے پاس گیا اور کارلس کے مظالم بتائے تاہم اپنے بیٹوں کی غلطی کو اس نے بیان نہیں کیا۔ فلپ نے ایک اشتہار جاری کروانے کا حکم دیا جس میں اعلان کیا گیا کہ جو ہیبت ناک کارلس کو پکڑ کر لائے گا اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔

کارلس کی جائے پناہ وادی آسٹوریس تھی۔ وہاں وہ اپنی بہن اور اپنی فوج کے ساتھ پناہ گزین تھا۔ وہ غریبوں اور مظلوموں کا ہمدرد تھا۔ اشتہار کے بعد کارلس کے رفقاء کی تعداد اب تگنی ہو گئی تھی۔ مظلوم اور فریادی اس کی جواں مردی اور شجاعت کا حال سن کر اور ظالم امیروں اور بادشاہوں کی زیادتیوں سے تنگ ہو کر اس کے جھنڈے تلے پناہ گزین ہو رہے تھے۔

بادشاہ کا وزیر پیئرز ایک مکار شخص تھا۔ وہ بادشاہ کی منظور نظر شہزادی ایوبی سے محبت کرتا تھا اور شہزادی ایوبی بھی بادشاہ کے بجائے اسے پیار کرتی تھی۔ گریشیا کارڈوا پر پیئرز نے بڑا ظلم کیا تھا۔ گریشیا قید سے فرار ہو گیا لیکن اس سے قبل وہ اپنی روحانی قوتوں کے بل پر شہزادی اور وزیر دونوں کو سخت سراسیمہ کر کے آیا تھا۔ وہ کارلس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے پیئرز کی

سرکردگی میں ایک فوج کارلس کا سامنے کرنے کے لیے بھیجی۔ چند غداروں کی وجہ سے کارلس اور اس کے ساتھیوں کو شکست ہوئی اور وہ قید کر لیے گئے۔ پیئر زنے بادشاہ کو اپنی کامیابی سنائی اور اسے یہ خبر بھی دی کہ گریشیا مارا گیا ہے۔ یہ خبر جھوٹی تھی کیونکہ گریشیا کو وزیر نے قید کرلیا تھا تا کہ وہ ان کے راز بادشاہ کے سامنے اگل نہ دے۔ شہزادی، وزیر پیئر زکی فتح پر بہت خوش ہوئی۔

''اور اگر چہ بادشاہ کے ساتھ وہ صرف تکلف محبت سے
پیش آتی تھی لیکن اوس نے اس وقت بادشاہ کو محبت آمیز
کلمات سے بے خود کر دیا اگر چہ اونکا سبب محض خود غرضی
تھی۔''(۱۳)

وزیر گریشیا کے گھر ہی میں قیام پذیر ہوگیا۔ اس نے گریشیا کو وہیں قید کر کر رکھا تھا۔ وزیر نے گریشیا کے پرانے ملازم کیسٹرو کے ذمے کام لگایا کہ وہ قیدی کے سامنے کھانا رکھ کر خاموشی سے واپس آجائے۔ زندان میں جب کیسٹرو کو علم ہوا کہ وہی قیدی اس کا آقا ہے اور دوسرا قیدی گریشیا کی بیوی ہے تو اس نے ان کی زنجیریں کھول دیں۔ ان سب نے مل کر بقیہ قیدیوں کو بھی رہائی دلوادی۔

گریشیا نے اپنی روحانی طاقت کے بل پر پیئر زاور شہزادی کے سامنے کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ خوفزدہ ہو گئے۔ بادشاہ ان روحوں سے بچنے کے لیے اسکوریل کے محل میں چلا گیا۔ کارلس اور شاہی فوج میں پھر لڑائی ہوئی۔ اس مرتبہ شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ کارلس کی فوج کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر کے سفر پر روانہ ہوئی۔ سمندر میں طوفان آنے کی وجہ سے فوج خشکی پر اتری۔ اسی وقت ہسپانیہ کی فوج نے انہیں گرفتار کرلیا۔

ایسپی نوسا قیدیوں کو پھانسی دینا چاہتا تھا کہ اسے اپنے بیٹوں کی آواز آئی ''باز آجاؤ، باز آجاؤ'' وہ رک گیا۔ ادھر شہزادی ایوبی اور پیئر زنے سازش کر کے بادشاہ کو شراب میں نشہ آور چیز ملا کر دے دی اور خود بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے ایسپی نوسا کا سر کاٹ دیا۔ گارشیا بادشاہ کو ہوش میں لایا اور اسے ساری صورت حال بتا دی۔ وہ بھرے دربار میں اس وقت آئے جب پیئر زتخت پر بیٹھنے لگا تھا۔ پیئر زاور شہزادی ایوبی کو قید کرلیا گیا۔ بعد کے واقعات میں وہ اپنے انجام

کو پہنچے۔ یوں ہر طرف امن امان ہو گیا۔ بادشاہ ای میلٹا پر عاشق ہو گیا لیکن گریشیا نے اسے روکا اور بتایا کہ وہ اس کی بیٹی اوراڈوارڈ کی بہن تھی۔ کارلس نے اپنی بہن کے ساتھ وہاں سے جانے کا ارادہ کیا اور کہا:

> ''میں اور میری پیاری بہن یہاں نتیجہ کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ کولمبس کے دریافت کیے ہوئے ممالک کے سرسبز جزائر میں ہسپانیہ کی نسبت زیادہ امن میں باقی زندگی بسر کریں گے۔'' (۱۴)

دربارلندن کے اسرار

رینالڈس کے ناول مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن کا ترجمہ دربارلندن کے اسرار کے نام سے کیا۔ ''اس ناول میں عیاشی کی برائیاں، بدمعاشی کے بدنتائج اور ریاکاری کی قباحتیں، سیاہ کاری کی سزائیں، خلق اللہ کے ساتھ بدسلوکی کا بدمعاوضہ، جرائم کی پاداش، نیکی کا اجر عفت اور عصمت کی جزا اور آخر کار بدی کی فاش شکست اور نیکی کی کامل فتح۔ یہ سب کچھ اس وقت کے شہزادوں، معززاور مقتدر امراء، امیر لیڈیوں کی رفتار و گفتار کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول کیا ہے ایک سحر ہے۔ یہ ناول چار جلدوں اور ۱۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ پنجاب پریس سیالکوٹ سے رسالہ ناولسٹ میں قسطوں میں بھی شائع ہوتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں طبع کیا گیا۔'' (۱۵)

اس ناول کو سلسلہ وار اور جلد وار چھاپا گیا۔ پنجاب گزٹ میں اس کی طباعت کی جو تفصیلات ملتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

دربارلندن کے اسرار پہلا سلسلہ پہلی جلد	۱۸۹۳ء
پہلا سلسلہ دوسری جلد	۱۸۹۳ء
پہلا سلسلہ تیسری جلد	۱۸۹۳ء
پہلا سلسلہ چوتھی جلد	۱۸۹۳ء

پہلے سلسلے کی چاروں جلدوں کو ۱۸۹۵ء میں دوبارہ چھاپا گیا۔

دربارلندن کے اسرار دوسرا اسلسلہ پہلی جلد ۱۸۹۷ء

دوسرا اسلسلہ دوسری جلد ۱۸۹۷ء

دوسرا اسلسلہ تیسری جلد ۱۸۹۷ء

دوسرا اسلسلہ چوتھی جلد ۱۸۹۷ء

اس کے بعد تیسرے سلسلے کی چار جلدوں کی تفصیلات ملتی ہیں ۔ دو جلدیں ۱۸۹۷ء میں اور دو ۱۸۹۸ء میں شائع کی گئیں:

دربارلندن کے اسرار نویں جلد تیسرا اسلسلہ پہلی جلد ۱۸۹۷ء

دربارلندن کے اسرار دسویں جلد تیسرا اسلسلہ دوسری جلد ۱۸۹۷ء

گیارھویں جلد تیسرا اسلسلہ تیسری جلد ۱۸۹۸ء

بارھویں جلد تیسرا اسلسلہ چوتھی جلد ۱۸۹۸ء

تیسرے سلسلے کی پہلی جلد میں لارڈ سکسینڈل کے بھتیجے ریلف کے قصے سے آغاز کیا گیا ہے۔ وہ اپنے چچا کی دولت ہتھیانے کے چکر میں تھا۔ ساٹھ سالہ لارڈ کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ ایک دن لارڈ نے سنا کہ ریلف نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ بوڑھے کی دولت کا وارث ہے۔ اسکے مرنے کے دن قریب ہیں اور اگر وہ نہ مرا تو وہ خود اس کو مارنے کی تدبیر کرے گا۔ بوڑھا بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے اپنے بھتیجے کے تین سو پونڈ سالانہ مقرر کر دیے جسے ریلف نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ لارڈ نے اس صورت حال میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ہریٹ کلفٹن کی سترہ سالہ بیٹی سے شادی کر لی۔ اس کے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک دن ریلف کو خبر ملی کہ اس کے چچا کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لڑکے کا نام ایڈمنڈ رکھا گیا۔ اس کے شانہ پر سٹرابری کے مانند چھوٹا سا پیدائشی نشان تھا۔ ریلف نے ایک جاسوس قاتل چفن کو مقرر کیا کہ وہ ننھے ایڈمنڈ کو مار دے۔ چفن نے لندن میں آکر بتایا کہ اس نے دایہ کے ہاتھ سے بچہ چھین کر اس کے منہ میں زہر کے قطرے ٹپکا کر ایک جھونپڑی کے سامنے وہ لاش پھینک دی۔ ثبوت کے طور پر اس نے بچے کے کپڑے دکھائے جس پر سکسینڈل کے خاندان کا نشان تھا۔

"لارڈ اور لیڈی کی حالت یہ خبر وحشت اثر سن کر نہایت

ہی ردی ہوگئی۔ لیڈی تو سکتہ کے عالم میں آ گئی اور لارڈ بچوں
کی طرح آہ وزاری کرنے لگا۔" (۱۶)

لیڈی نے لندن جا کر بھیس بدل کر خود تحقیقات کرنے کا ارادہ کیا۔ خادمہ میبل کو وہ ساتھ لے گئی۔ اس نے اپنے پہلے خطوط میں بتایا کہ وہ ایک بیوہ فرنی کے پاس ٹھہری ہے اور اس نے اپنا نام مسز سمتھ رکھا ہے۔ چند اور خطوط کے بعد اس نے خوش خبری دی کہ لڑکا مل گیا ہے اور وہ عنقریب اسے لے کر آ رہی ہے۔ اس دوران میں لارڈ سخت بیمار ہو گیا لیکن اس نے لیڈی کو اطلاع نہ دی۔

ریلف نے ایک دن اخبار میں پڑھا کہ لارڈ مر گیا ہے۔ وہ فوراً لندن سے لنکن شائر پہنچا۔ وہ اپنے تئیں اس کی جائیداد کا واحد وارث سمجھ رہا تھا۔ وہاں لیڈی بھی آ پہنچی اور اس نے ریلف کو بتایا کہ اس نے اپنے بیٹے کو تلاش کر لیا ہے۔ اس نے رات کو ریلف کو گرجا بلایا۔ اور وہاں اسے بتایا کہ اس نے اور لارڈ نے اپنے بیٹے کے لیے ۲۰ ہزار پونڈ جمع کیے ہیں جن میں سے پانچ ہزار دینے کا وعدہ اس نے ریلف سے کیا اور کہا کہ اس گرجا کے تہہ خانے میں وہ رقم موجود ہے۔ وہ اپنی خادمہ اور ریلف کے ساتھ اس تہہ خانے میں پہنچی جہاں بہت اندھیرا تھا۔

ان واقعات کے چار دن بعد چفن اور اس کے ساتھی چوری کرنے کے لیے لارڈ کے قلعہ میں آئے۔ وہاں کے محافظوں کو خبر ہو گئی۔ وہ چور دوڑتے ہوئے گرجا کے تہہ خانے میں جا پہنچے۔ وہاں موجود مشعلوں کو جلا کر انہوں نے دیکھا تو انہیں ریلف کی لاش ملی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مرے تین چار دن سے زیادہ نہیں گزرے۔ چفن نے لاش کی گھڑی اور زنجیر اتار کر لاش کو وہیں رہنے دیا اور خود وہ باہر آ گئے۔

اس کے بعد انیس سال بعد کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ منظر ایک تماشا گاہ کا ہے جہاں خوبصورت لیڈیاں بھی تھیں۔ ان میں ایک لیڈی جس کا نام فلورینا شانٹن تھا۔ وہ لارڈ ایڈمنڈ کے ساتھ منسوب تھی۔ ایڈمنڈ کے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ

"بڑا مغرور اور اوباش تھا اور بڑا خرچ کرنے والا تھا اور
ہر طرح کے عیب میں مبتلا تھا۔ وہ پست قد تھا اور اگرچہ
بدصورت تو نہ تھا مگر اس کو خوبصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ

بہنوں کے ساتھ ہمیشہ جھگڑتا رہتا تھا اور ماں کا کہنا نہیں مانتا تھا۔ ماتحتوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا اور ہر ایک کے ساتھ بدسلوکی کرتا۔ غرض اس میں ایسے اوصاف جمع تھے کہ ہر طرح نفرت اور حقارت کے ساتھ دیکھا جانے کے قابل تھا۔'' (۱۷)

اس کے بعد مختلف واقعات سے دکھایا گیا ہے کہ ایڈمنڈ کن بری عادات کا شکار تھا۔ لیڈی انجیلا، دی ویلڈی اور ایمیلی آرچر کے حالات و واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایڈمنڈ کے ساتھ ان کے تعلقات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ فلورینا ولیم ڈیورل سے محبت کرنے لگی جو ایک غریب مصور تھا اور وہ اسے مصوری سکھانے پر مامور تھا۔

اس طرح حسن و عشق کے بیانات، سازشوں کے جال اور ایڈمنڈ کے عیش و عشرت کے ساتھ اس جلد کا اختتام ہوتا ہے۔

موتیوں کا جزیرہ

الیگزینڈر ڈوما کے کے فرانسیسی ناول کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ غلام قادر فصیح نے کیا ہے۔ اس تاریخی ناول کا زمانہ فرانس کا وہ دور ہے جب شہنشاہ نپولین نے جزیرہ البا سے آکر دوسری بار فرانس کو فتح کیا۔ اس تاریخ کے پس منظر میں حسن و عشق اور انتقام سے بھرپور اس ناول کے واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ غلام قادر فصیح کا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا۔ اردو ترجمے کی تاریخ میں بھی اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ناول کی غیر معمولی مقبولیت اور ہمہ گیر دلچسپی کے پیش نظر اس کا مفصل تجزیہ تیسرے باب میں کیا گیا ہے۔

دربار پیرس کے اسرار

اس ناول میں فرانس کے دارالخلافہ پیرس کے بادشاہوں، شہزادوں، معزز امرا اور امیر لیڈیوں اور جنگ جو آدمیوں کے حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں مذکور ہیں۔ یہ ناول بالکل تاریخی رتبہ کا ہے۔ اس کے مطالعہ سے فرانس کی اعلیٰ سوسائٹی کے اندرونی حالات سے وسیع

واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ناول پنجاب پریس سیالکوٹ سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔(۱۸)
۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء کے پنجاب گزٹ کی معلومات کے مطابق ان جلدوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. "Darbar.i.Paris ke Asrar" Pehli Jild mausum ba Zarif.i.chequtte (Mysteries of the court of the Paris Vol.1, called Chequtte the Jester) (۱۹)

2. "Darbar.i.Paris ke Asrar" Dusri jild mausum ba Pantalis Shahi Muhafiz (Mysteries of the court of Paris, vol II. (۲۰)

3. "Darbar.i.Paris ke Asrar" Tisri jild mausum ba Tin Banduqchi (Mysteries of the court of Paris, vol.III, named Three Musketeers) (۲۱)

شہر پیرس کے اسرار

اس ناول میں شہر پیرس دارالخلافہ فرانس کے اسرار کا بیان ہے۔ جو جرمنی کے ایک شہزادہ کی حیرت انگیز کاروائیاں جو تبدیل لباس پیرس میں سکونت پذیر رہا، درج ہیں۔ پیرس کی امیر لیڈیوں اور دیگر اشخاص کے حیرت ناک کارناموں کا ذکر نہایت دلکش پیرایہ میں مذکور ہے۔(۲۲)

یہ ناول دو جلدوں میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۸۹۵ء میں جبکہ دوسری جلد ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔

ایڈورڈ گبن کی لائف اور اس کی تصانیف کا تذکرہ

اس میں مشہور و معروف انگریز کی لائف ہے جس نے سلطنت روما کے زوال کی ضخیم اور مشہور تاریخ لکھی ہے۔(۲۳) Life of Edward Gibbon and an account of his works کا ترجمہ غلام قادر فصیح نے کیا ہے۔

براؤن سٹیچو آرور جن کس (بت روئیں یا بوسہ بکر)

یہ ناول دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سبحانی پریس لاہور سے شائع ہوا۔ رینالڈس کے ناول Bronze Statue کا ترجمہ ہے۔

اس عجیب وغریب اور دلچسپ ناول میں بوہیما واقعہ آسٹریا کی عیسائی سوسائٹی کے حالات اوران کی دینداری کے لباس میں چھپی ہوئی برائیوں کا تذکرہ ہے۔اس میں عجیب وغریب حیرت انگیز اسرار کا بیان ہے اور جان برنسکا کی لڑائیوں کے حالات جن کی وجہ سے عیسائی سوسائٹی میں بڑا ہی بھاری انقلاب پیدا ہوا۔ (۲۴)

عمر پاشا

رینالڈس کے اس تاریخی ناول کا ترجمہ دو جلدوں میں غلام قادر فصیح نے پہلی بار ۱۸۹۳ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع کیا۔ ۱۸۹۳ء کے پنجاب گزٹ میں کتب کی فہرست میں اس کتاب کا ذکر بھی ہے۔ دیگر تفصیلات کے علاوہ اس کے ریمارکس میں درج ذیل جملے تحریر ہیں:

An Urdu translation of the sensational novel by Mr. Reynold whose works now.a.days seem to find much favour with the educated young. (۲۵)

عوام میں مقبولیت کے پیش نظر 1895ء میں اس کی دونوں جلدیں دوبارہ شائع کی گئیں۔ پنجاب گزٹ میں درج ذیل عبارت اس کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے:

Translation of a novel describing the adventures of a christian convert to Islam in Turky. (۲۶)

ناول کی ابتداء میں قروشیہ کی جغرافیائی تقسیم بیان کی گئی ہے۔

''قروشیہ کا ملک دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک حصہ تو
سلطنت آسٹریا کے ماتحت ہے۔دوسرا سلطان ٹرکی کے زیر
حکومت ہے اور اس طرح ایک حصہ آسٹرین قروشیہ کے نام
سے ہے اور دوسرا ٹرکش قروشیہ کے نام سے موسوم
ہے۔''(۲۷)

جون ۱۸۲۰ء کو ایک دن علی الصباح شہر کارٹساٹ کے باشندے خواب راحت سے بیدار ہو کر جلد جلد تیاری میں مصروف تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فوجی ریویو کا دن تھا۔آسٹریا سے مزید فوجیں طلب کی گئی تھیں۔کمانڈر انچیف بین فوجوں کے معائنے کے لیے آیا۔اس نے ''سرحدی فوج'' میں سے نقص نکالنا چاہے لیکن اسے کوئی خرابی نظر نہ آئی جس کی وہ نشاندہی کر سکے۔اس نے ایک سپاہی نوجوان لفٹننٹ لاٹس کو دھکا دینا چاہا۔لاٹس نے غصے میں آ کر اسے زمین پر گرا دیا۔

لاٹس کو قید کر دیا گیا۔رحم دل کرنل کروز نے اسے بین سے معافی مانگنے کے لیے کہا لیکن لاٹس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔کرنل کروز نے اسے قید سے بھاگنے میں مدد دی۔وہ قید سے بھاگ کر اپنے گاؤں آیا اور اپنے چچا اور بھائی جوزف سے ملا۔وہ وہاں سے قسطنطنیہ آیا جو سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا۔

''ہمارے نوجوان ہیرو نے اچھی تعلیم پائی تھی۔چوں
کہ وہ اگرام کے فوجی کالج میں رہا تھا اس لیے اس نے کئی
ایک زبانیں بھی سیکھ لی تھیں اور وہ جرمن، لاطینی، فرانسیسی،
انگریزی اور ترکی بخوبی بول سکتا تھا۔''(۲۸)

ترکی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے لاٹس وزیر جنگ خسرو پاشا کے پاس گیا لیکن خسرو کی علالت اور مصروفیت کی وجہ سے وہ اسے نہ مل سکا۔وہ مایوس ہو رہا تھا۔ایک دن اس نے ایک بوڑھے ترک کی جان بچائی۔اس بوڑھے نے لاٹس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھے، اسے کامیابی ہوگی۔اس سے اگلے دن وہ وزیر جنگ سے ملنے گیا تو خلاف توقع اس سے ملاقات کرا دی

گئی۔ وہ وزیر جنگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ وہی بوڑھا ترک تھا جس کی جان اس نے بچائی تھی۔ خسرو پاشا سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا:

''میں ترکی آئین سے بخوبی واقف ہوں اور میں پہلے سے اس شرط کے پورا کرنے کے لیے تیار ہوآیا ہوں۔ نہ صرف آسٹریا کی حکومت کو پسند ہی نہیں کرتا بلکہ اس مذہب کو بھی ناپسند کرتا ہوں جس کے پیرو اس قدر ظالم اور جابر ہوتے ہیں او رمیں اپنے اجداد کا مذہب ترک کرنے پر تیار ہوں۔''(۲۹)

خسرو پاشا نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے مال و دولت دے سکتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ملک میں چلا جائے۔ اگر اس کا دل نہیں مانتا تو وہ اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک مت کرے۔ لائس نے کہا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ خسرو پاشا اس کی فوج میں شمولیت سے خوش ہو گیا اور اسے کہا کہ آئندہ تمہارا نام عمر ہوگا۔

جون ۱۸۲۳ء میں ایک ترکی رجمنٹ کوچ کرتی ہوئی نودی شہر کو پہنچی۔ اس کے کمانڈنگ افسر کو شہر کے باشندے بڑا پسند کرتے تھے۔ وہ بڑے کم عرصے میں اعلیٰ درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ وہ بین کے کھڑے کیے گئے تنازعہ کو نمٹانے آیا تھا۔ اس نے ضلع کا جائزہ لیا اور آسٹریا کمان افسر کو کہلا بھیجا کہ چونکہ ضلع کلادس عہد نامہ کے رو سے ٹرکی سلطنت میں شامل ہے اس لیے آسٹرین فوج اسے جلد خالی کر دے۔ وہ افسر نہ مانا اور نتیجے میں دونوں فوجوں نے لڑائی کی۔ ترکی فوج کو فتح ہوئی۔ بین لڑائی میں زخمی ہو گیا۔ وہاں میدان جنگ میں ترک کمانڈنگ افسر نے بین کو بتایا کہ وہ درحقیقت وہی قیدی ہے جسے اس نے قید کیا تھا۔ بین نے اسے پہچان لیا۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا۔ ضلع کلادس کی فتح پر خسرو پاشا نے عمر کو جنرل کے عہدہ پر ممتاز فرمایا اور ساتھ ہی سلطان المعظم نے الطاف خسروانہ سے پاشا کا شاہی خطاب عطا فرمایا۔

ایک شام عمر پاشا کے پاس کرنل کروز آیا اور اسے بتایا کہ بین کا بیٹا دانیال لمبرگ اس کے خون کا پیاسا ہے اور وہ اپنے باپ کا بدلہ اس ترکی افسر سے لینا چاہتا ہے۔ دوسرے دن دوپہر

کے وقت عمر پاشا کے سامنے ایک نوجوان آیا۔ اس نے ملازمت کی درخواست عمر کے سامنے پیش کی اور کہا کہ اس کا نام ارنالڈ ہے اور وہ آسٹریا کے مظالم کا ستایا ہوا ہے اور ترک فوج میں نوکری کرنا چاہتا ہے۔ عمر پاشا نے اسے پہچان لیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کب سے دانیال سے ارنالڈ بن گیا۔ ارنالڈ نے فوراً اس پر حملہ کر دیا لیکن جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔ عمر نے اسے معاف کر دیا اور اسے جانے کو کہا۔

خسرو پاشا نے اپنی بھتیجی سلیمہ کی شادی عمر پاشا سے کر دی۔ ۱۸۳۹ء میں سلطان نے اسے بلایا اور اسے ایک لڑکی کو بحفاظت آسٹریا کے صوبہ ٹرنسلونیا اس کے باپ بیرن کے پاس پہنچانے کی وصیت کی۔ سلطان کی خواہش کے مطابق عمر پاشا، سلیمہ اور عائشہ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا۔ راستے میں دانیال لمبرگ نے عمر پاشا پر حملہ کر دیا لیکن وہ وار سلیمہ نے اپنے سینے پر لے لیا۔ اس نے اپنے شوہر کے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔ بعد کے واقعات سے علم ہوتا ہے کہ عمر پاشا نے عائشہ کی خواہش پر اس سے شادی کر لی۔

۱۸ مئی ۱۸۵۳ء کا دن عثمانیہ سلطنت کی تاریخ میں بڑا ہی قابل یادگار ہے۔ اس دن روس کی آخری خواہش بڑی حقارت اور ذلت کے ساتھ رد کر دی گئی تھیں۔ یکم جولائی ۱۸۵۳ء کو سلطان عبدالمجید نے عمر پاشا کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔

پہلی جلد میں ۴۹ باب ہیں۔ اس میں عمر پاشا کی بہادری کے قصے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے ذیلی قصے اور کردار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ پہلی جلد ۴۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری جلد میں باب نمبر ۵۰ سے باب نمبر ۸۸ یعنی ۳۸ ابواب دوسری جلد میں شامل ہیں۔ اس میں جنگ کریمیا میں ترکی کی فتح اور عمر پاشا کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ قلعہ سوچوم کی فتح اور آخر کار منگریلیا کی فتح بیان کی گئی ہے۔ عمر پاشا نے منگریلیا کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقدم مبارک محض اس غرض کے لیے ہے کہ ہم تم لوگوں کو سچی نجات کی برکتوں سے مستفید کریں۔ یہ نہیں کہ جور و جفن کا ایک جوا تمہاری گردنوں سے اتار کر نئے ستم کا بوجھ تمہاری پیٹھوں پر لاد دیں۔ تم لوگ اب عثمانیہ حکومت کے زیر سایہ آ گئے۔ اب تمہیں روسیوں کے تشددات کا کوئی خوف و ہراس نہ کرنا چاہیے۔ (۳۰)

آخر انگوری کی لڑائی میں عمر پاشا کی فوج نے روسیوں کو پسپا کر دیا۔ اس خوشی میں اپنا عہد پورا کرتے ہوئے عمر پاشا نے اپنے بھتیجے طارق کو پاشا کا لقب عطا فرمایا۔ اس ناول کی آخری سطور یہ ہیں:

''اور جو کچھ مراسم خزانہ اور عنائتیں خود سلطان المعظم نے عمر پاشا پر کیں اونکے بیان کرنے کے لیے ایک علمی رسالہ چاہیے۔'' (۳۱)

فسانہ عجیب الخلقت یا گلیور صاحب کی سیر

یہ کتاب سیر و سیاحت کے حوالے سے چند انوکھے تجربات پر مشتمل ہے۔ اس کا ترجمہ غلام قادر فصیح نے کیا اور یہ کتاب ۱۸۹۵ء میں سبحانی پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کے پہلے صفحے پر عنوان و مترجم کے بعد درج ذیل عبارت درج ہے:

''یہ کتاب اپنے فن کی پہلی ہے۔ اس میں دنیا کے
دور دراز حصہ کے عجیب الخلقت مخلوق کا بیان ہے۔ پہلے سفر
میں چھ چھ انچ کے انسانوں کے حالات درج ہیں جس کے
پڑھنے سے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل نہ پڑ جائیں تو کہنا۔
مصنف نے اپنے چشم دید واقعات قلم بند کیے ہیں جو قابل
دید ہیں۔ دوسرے سفر میں مصنف نے ایک اور عجیب ملک
میں پہنچ کر وہاں کی مخلوق دیوزاد تیس تیس گز قد کے دیکھ کر ان
کے حالات لکھے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دونوں سفر اس قدر
دلچسپ ہیں کہ جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ضرور منگا کر لطف
حاصل کریں خاص کر وہ حضرات جنہیں سیر و سیاحت کا شوق
ہو۔'' (۳۲)

پہلے باب میں مصنف نے اپنے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ اور اپنا طبعی میلان سیر و

سیاحت کا بتایا۔ اس کا جہاز طوفان کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ تیرتا ہوا ایک جزیرے میں آ جاتا ہے۔ تھکن سے بے حال ہو کر وہ وہاں لیٹتا ہے اور سو جاتا ہے۔ جب وہ جاگا تو اس نے دیکھا کہ وہ بندھا ہوا ہے۔

''میرے قریب کچھ شور سنائی دیا مگر چوں کہ میں ادھر اُدھر نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے میں معلوم نہ کر سکا کہ وہ شور کیسا ہے۔ تھوڑی دیر میں مجھے معلوم ہوا کہ کوئی زندہ چیز میری بائیں ٹانگ پر حرکت کرتی ہے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر تھوڑی کے قریب آئی۔ میں نے نظر نیچے کی اور جہاں تک میں دیکھ سکا مجھے معلوم ہوا کہ ایک بشر جس کا قد قریباً چھ انچ تھا تیر کمان ہاتھ میں لیے اور ترکش کاندھے پر ڈالے آ رہا ہے۔ اسی اثنا میں قریباً چالیس اور اسی قد و قامت کے مسلح پہلے کے پیچھے ہو لیے۔ میں اس نظارہ سے سخت متعجب ہوا اور اس قدر زور سے گرجا کہ وہ سب کے سب ڈر کر بھاگ گئے۔'' (۳۳)

مصنف ان بونوں کی دیدہ دلیری پر سخت حیران تھا کہ وہ اس کے بدن پر بغیر خوف و خطر کے چل رہے تھے اور انہیں اپنی جان کا بھی کچھ خیال نہ تھا۔

دوسرے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ بونوں کا بادشاہ للّی پٹ مع اپنے امرا و زرا کے مصنف کو قید خانہ میں دیکھنے آتا ہے۔ شہنشاہ کے اوضاع و اطوار اس باب میں بیان کیے گئے ہیں۔ چند عالم مصنف کو وہاں کی زبان سکھانے کے لیے مقرر کیے گئے۔ مصنف کی تلاشی لی گئی اور اس کی تلوار اور پستول اس سے چھین لی گئی۔

''چونکہ میرے پہنچنے کی خبر تمام سلطنت میں پھیل گئی۔
اس لیے غرب امیر ہر درجہ کے آدمی مجھے دیکھنے کے لیے

بکثرت آنے لگے یہاں تک کہ گانو کے گانو خالی ہو
گئے۔"(۳۴)

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ مصنف شہنشاہ اور اس کے امراء کو عجیب طور طریقوں سے بہلاتا ہے۔ وہ دربار لِلی پٹ کے تماشے بیان کرتا ہے۔ مصنف کو قید سے چند شرائط پر آزادی ملتی ہے۔ وہ نو شرائط یہ تھیں:

اولاً: انسانی پہاڑ ہمارے لائسنس کے بغیر ہماری حکومت سے نہ جائے۔

ثانیاً: وہ بغیر ہمارے حکم کے ہمارے دارالخلافہ میں نہ آئے۔ جس عرصہ میں کہ باشندگان شہر کو مطلع کیا جائے گا کہ وہ دو گھنٹے کے اندر دروازے بند کرلیں۔

ثالثاً: وہ بڑی بڑی سڑکوں پر پھرا کرے اور کسی چراگاہ یا کھیت میں نہ لیٹے۔

رابعاً: جب وہ سڑکوں پر چلے تو اس بات سے خبردار رہے کہ ہمارا کوئی آدمی گھوڑا یا گاڑی اس کے پاؤں کے نیچے نہ آجائے اور نہ ہماری رعایا میں سے کسی کو بغیر اس کی مرضی کے ہاتھ میں پکڑے۔

خامساً: اگر کوئی ضروری حکم باہر جلد بھیجنا ہو تو انسانی پہاڑ ہمارے ایلچی اور گھوڑے کو جیب میں ڈال کر لے جائے اور اسے صحیح وسالم واپس لائے۔

سادساً: ہمارے دشمن جو جزیرہ بلفیسکو میں ہیں ان کے خلاف انسانی پہاڑ ہمارا معاون ہوگا اور حتی المقدور ان کے جنگی جہازات تباہ کرنے میں سعی کرے گا جو ہم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

سابعاً: انسانی پہاڑ فرصت کے وقت ہمارے کاریگروں کو بڑے بڑے پتھر شاہی شکارگاہ اور شاہی محلوں کے لیے اٹھانے میں مدد دیا کرے۔

ثامناً: انسانی پہاڑ کامل دو ماہ میں ہماری حکومت کا کل رقبہ اپنے قدموں سے پیمائش کر کے ظاہر کرے۔

آخری: انسانی پہاڑ مذکورہ بالا شرائط منظور کرے تو اسے ہر روز ہماری رعایا کے ۱۷۲۴ آدمیوں کی خوراک مفت ملا کرے گی اور ہمیشہ الطاف شاہانہ کا سزاوار رہے گا۔(۳۵)

مصنف بہت حیران ہوا کہ ۱۷۲۴ آدمیوں کے حوالے سے اس کی خوراک کا اندازہ

کیسے لگایا گیا تو اسے بتایا گیا کہ

''شہنشاہ کے حساب دانوں نے میرے بدن کی پیمائش کی اور اس طرح معلوم کیا کہ للّی پٹ کے 1724 آدمیوں کی پیمائش میرے برابر ہوتی ہے۔ اس حساب سے تخمیناً کہا گیا کہ اتنے آدمیوں کی خوراک میرے لیے کافی ہوگی۔ اس سے ناظرین ان لوگوں کی ہشیاری اور شہنشاہ کی کفایت شعاری کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔''(۳۶)

چھٹے باب میں وہاں کے باشندوں، ان کے علم، قوانین اور رسوم کا مختصر حال، بچوں کو تعلیم دینے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

''اس ملک کے تمام جانور اور درخت وغیرہ بھی مناسب قد کے ہیں مثلاً بڑے سے بڑا گھوڑا یا فیل اونچائی میں چار سے پانچ انچ تک اور بھیڑ ڈیڑھ انچ تک ہے۔''(۳۷)

''وہ اپنے مُردوں کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے دفن کرتے ہیں کیوں کہ ان کا یہ خیال ہے کہ گیارہ ہزار چاند کے بعد مردے سب کے سب جی اٹھیں گے۔''(۳۸)

للّی پٹ کے باشندے دغابازی کو چوری سے بھی زیادہ بڑا جرم گردانتے ہیں اور اس لیے اکثر اس کی سزا سزائے موت ہے۔

مصنف کو جب علم ہوتا ہے کہ چند سازشیوں نے اس کے خلاف بادشاہ کو بھڑکا دیا ہے اور اس پر بڑا بھاری جرم عائد کر دیا گیا ہے تو وہ وہاں سے بھاگ آتا ہے اور بڑی مشکل سے اپنے ملک میں واپس پہنچ جاتا ہے۔

حصہ دوم میں مصنف کا جہاز طوفان کا شکار ہو جاتا ہے اور اس بار وہ ایک ایسے جزیرے

میں جا پہنچتا ہے جہاں عجیب وغریب اور بلند قامت اشیا تھیں ۔وہاں کی گھاس ۲۰ فٹ، فصیل ۴۰ فٹ، کھیت کی باڑ ۱۲۰ فٹ تھی ۔درخت اس قدر طویل تھے کہ مصنف ان کے طول کا تخمینہ ہی نہ کر سکا۔اس نے ایک مزدور کو دیکھا۔جس نے مصنف کو دیکھا اور بہت حیران ہوا۔

''بعدازاں مجھے ایک انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ کمر سے
پکڑا اور اٹھا کر اپنی آنکھوں کے نزدیک لایا تا کہ میری شکل و
شباہت بغور دیکھے۔''(۳۹)

وہ مزدور اسے اپنے گھر لے گیا۔اب قرب وجوار میں مشہور ہو گیا کہ میرے مالک نے ایک عجیب جانور کھیت میں پایا ہے جس کا قد بہت چھوٹا اور صورت انسان کے مشابہ ہے اور اپنی چھوٹی زبان میں انسان کی طرح گفتگو بھی کرتا ہے اور اس ملک کی زبان کے بھی اس نے چند الفاظ سیکھ لیے ہیں ۔مصنف دربار میں بلایا جاتا ہے ۔ملکہ اسے اس کے مالک سے خرید لیتی ہے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرتی ہے۔مصنف بادشاہ کے علماء کے ساتھ مباحثہ کرتا ہے۔ملکہ اس پر بہت مہربان ہوتی ہے ۔مصنف نے ملک کا حال ، بڑے مندر کا بیان ، ایک مجرم کا قتل ہو جانا ، چند حادثات ، مصنف کا ہنر جہاز رانی دکھانا۔سب واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے ۔ مصنف کا طریق سیر یہ تھا

''میری دایہ اکثر مجھے چھوٹے بکس میں باغات کی سیر
کرانے کو لے جاتی تھی اور بعض اوقات مجھے باہر نکال کر باغ
میں بٹھا دیتی ۔''(۴۰)

ایک دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔باورچیوں نے ایک بندر رکھا ہوا تھا۔اس نے مصنف کو دیکھ لیا اور اس طرح چھاتی سے لگا لیا جیسے دایہ بچے کو دودھ پلانے لگتی ہے۔جب مصنف نے اس کے ہاتھ سے مخلصی پانے کی کوشش کی تو اس نے اتنے زور سے دبایا کہ مجبوراً مصنف کو خاموش ہونا پڑا۔وہ بندر اسے اس طرح پیار کر رہا تھا جیسے اپنے بچوں کو پیار کر رہا ہو۔

بادشاہ اور ملکہ سرحد کو تشریف لے جاتے ہیں ۔مصنف بھی ہمراہ جاتا ہے۔وہاں ایک بڑا عقاب دایہ کے ہاتھ سے وہ بکس لے اڑتا ہے جس میں مصنف بند تھا۔وہ صندوق سمندر میں گر پڑا۔

مصنف نے زور زور سے آوازیں دیں۔ایک جہاز جو قریب تھا انہوں نے وہ صندوق اوپر کھینچ لیا۔ مصنف کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔اس نے انہیں سارا قصہ سنایا اور اسی جہاز پر سوار ہو کر واپس اپنے وطن انگلینڈ پہنچ گیا۔

دربار روس کے اسرار

یہ ناول دو جلدوں میں ہے۔پہلی جلد ۱۹۰۱ء میں جبکہ دوسری جلد ۱۹۰۶ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

حالات چین مع تصاویر

یہ کتاب An Account of China with Illustrations کا ترجمہ ہے۔یہ پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب میں چین کی تاریخ وہاں کے باشندوں کے حالات، ان کی طرز معاشرت، ان کے مذہبی اعتقادات اور دیگر تاریخی واقعات نہایت لطیف پیرایہ میں مذکور ہیں۔(۴۱)

عجائبات امریکہ

یہ کتاب اپنے فن میں پہلی ہے۔ملک امریکہ کے عجائبات اس میں مفصل درج ہیں۔غلام قادر فصیح نے اس کتاب میں عجائبات کی منظر نگاری نہایت خوبصورت پیرائے میں کی ہے۔اور حیرت افزا بیان، دلکش اور رنگین ہے۔(۴۲)

تسخیر القمر

ایک دلچسپ عجیب وغریب انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔اس میں بھی مترجم نے پوری محنت سے ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ترجمہ نگاری میں یہ کتاب قابل قدر ہے۔(۴۳)

پہلا پارہ

جلی قلم میں اردو، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ غلام قادر فصیح نے قرآن حکیم کے اس پارے کا ترجمہ نہایت غور وخوض اور عالمانہ بصیرت سے کیا ہے۔ (۴۴) ۱۸۹۹ء میں یہ ترجمہ پنجاب پریس سیالکوٹ سے چھپا۔

پنج گنج الٰہی

قرآن مجید کی سورۃ فاتحہ اور آخری چار سورتوں کی تفسیر اور ترجمہ شائع کیا۔

وطن پر قربانی یعنی ہالینڈ کی آزادی

اس تاریخی ناول کا ترجمہ ۱۹۰۸ء میں قومی پریس سیالکوٹ سے شائع ہوا۔ ۱۹۰۹ء کے پنجاب گزٹ کی کتب کی فہرست میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور درج ذیل الفاظ میں اس کا تعارف بیان کیا گیا ہے:

"This historical novel has its scene laid at the time when Holland was under the galling yoke of spain in 1844. Leydon, the centre of the Hollanders, has been specially depected as the scene of great atrocities where the Spanish Government was daily shedding the blood of hundreds of Hollanders who followed Luther and were consequently considered as infidles or non.believers by the Roman Catholics.

Prince Orange, known as William the silent, secured the independence of the

country through the valour and the perseverance of the Hollanders who helped him with men and money." (۴۵)

اس ناول کے واقعات ۱۸۴۴ء سے شروع ہوتے ہیں جب ہالینڈ شاہ ہسپانیہ کے ماتحت تھا اور شاہی حکم سے ایک مذہبی عدالت قائم کی گئی تھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ ان لوگوں کو جو رومن کیتھولک مذہب سے روگردان ہو کر لوتھر کے پیرو بن گئے تھے، گرفتار کر کے طرح طرح کے عذاب سے ہلاک کرے۔ اور اس طرح مرتدوں کو چن چن کر قتل کرے۔ یہ مذہبی جوش اس قدر ترقی پر تھا کہ نہایت خطرناک نظارے ہالینڈ کے شہروں میں دکھائی دیتے تھے۔ تمام ملک میں ایک کہرام مچا ہوا تھا اور لوگوں کا جان و مال سخت غیر محفوظ تھا۔ ہسپانی حکام نے اس مذہبی سرگرمی کو اپنی نفسانی خواہشات برلانے اور لوگوں سے روپیہ بٹورنے کا آلہ بنا رکھا تھا۔ جس کو چاہتے مرتد قرار دے کر گرفتار کر لیتے اور خفیہ تحقیقات میں ایک دو گواہ پیش کر کے سزائے موت کا حکم صادر کر دیتے۔ اور اگر ان کا مطلب حاصل ہو جاتا تو اسے چھوڑ دیتے ورنہ بری طرح سے عذاب دے کر مار ڈالتے۔

یہ حالات تھے کہ ایک دن پچھلے پہر شہر لیڈن کے باہر لوگ جمع ہوئے۔ جاڑے کا موسم تھا اور نہر کا پانی اس قدر جم گیا تھا کہ لوگ بآسانی اس پر چل سکتے تھے اور دستور کے موافق آج برف پر گاڑیوں کی دوڑ ہونی تھی۔ تمام شہر کے زن و مرد تماشا دیکھنے آئے تھے اور بہت سے آدمی اپنی اپنی گاڑیاں دوڑ کے لیے لائے تھے۔

کیرولس کی بیٹی لزبتھ بھی اس دوڑ کو دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ اس کا باپ کیرولس فوت ہو چکا تھا اور بہت سی جائیداد بیٹی کے نام چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنی خالہ کلارا کے ہمراہ رہتی تھی۔ اس کے دو چچیرے بھائی ڈرک اور پیٹر تھے۔ ڈرک لندن میں کارخانہ دار کے پاس کچھ عرصہ کام کر کے حصہ دار بن گیا تھا۔ اس کی عمر ۲۴، ۲۵ سال تھی۔ لزبتھ اور ڈرک دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن ابھی تک کسی نے بھی اظہار نہ کیا تھا۔

میلہ میں لزبتھ اپنی خادمہ گریٹا کے ہمراہ تھی۔ وہاں اسے ایک عورت ملی جس کی عمر ۳۰،

۳۵ سال تھی اس کا نام مارتھا تھا۔ اس کا چہرہ داغدار تھا اور وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس نے لزبتھ کو بتایا کہ کبھی وہ بھی خوبصورت تھی۔ ظالموں نے لوہا جلا جلا کر اس کا چہرہ داغدار کر دیا ہے کیونکہ اس کے شوہر کو مرتد قرار دے دیا گیا تھا اور وہ اس سے اسی کے شوہر کے خلاف گواہی لینا چاہتے تھے۔ اس نے بتایا کہ مجھے بڑا عذاب دیا گیا اور میرے شوہر اور بچے کو اسی طرح سے مار ڈالا گیا۔ میں اس وقت سے پاگل ہوں اور خلیج میں حیوانوں کی زندگی بسر کرتی ہوں۔ آج میں لوگوں کو کہنے آئی ہوں خواہ کوئی سنے یا نہ سنے کہ

> ''جب تک ملعون ہسپانیوں کو ملک سے نہ نکال دو گے تو کوئی دن آئے گا کہ ہمارے بال بچے روٹی کے ٹکڑہ کو ترسیں گے۔ اور بھوک کی موت مریں گے۔ تمام گلی کوچے فاقہ کشوں سے بھر جائیں گے ہاں۔ ہاں یہ بالکل درست ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ جب تک ملعون ہسپانی اور ان کی خونی عدالتیں نیست و نابود نہ ہوں گی۔ تب تک لیڈن شہر کے باشندوں کو کبھی آسودگی نصیب نہ ہوگی۔''(۴۶)

معاً مارتھا کی نظر ایک عورت پر پڑی جس کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ عورت درختوں کی آڑ سے نکلی اور لزبتھ سے کہا کہ تمہاری صحبت اچھی نہیں۔ لزبتھ نے صفائی پیش کی کہ میں اس عورت کو جانتی تک نہیں۔ وہ خود ہی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس عورت میگ نے کہا کہ مارتھا مرتد اور جادوگرنی ہے۔ اس کی گرفتاری پر انعام مقرر ہے۔ میں اسے گرفتار کر کے ضرور انعام حاصل کروں گی۔ یہ کہہ کر وہ مارتھا کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

لزبتھ نہایت غمگین ہو گئی۔ وہ خود رومن کیتھولک کی سخت پابند تھی مگر مرتد لوگوں کے عذاب دیے جانے پر نہایت کڑھتی تھی۔ اسی دوران میں پیٹر اور ڈرک آن پہنچے۔ لزبتھ نے دونوں کو وہ واقعہ سنایا۔ ڈرک نے اس عورت مارتھا کی طرف داری کی۔ پیٹر نے اس دوڑ میں حصہ لیا۔ اس دوڑ کا اصول یہ تھا کہ ہر ایک شخص اپنی گاڑی میں ایک لیڈی جسے وہ پسند کرتا بٹھا لیتا تھا۔ اور پھر دوڑ شروع ہوتی تھی۔ ہسپانی فوج کا کپتان جوآن بھی اس دوڑ میں شامل تھا۔ اس نے ڈرک کے ساتھ کھڑی ہوئی لزبتھ کو گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ ناچار اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس دوڑ میں

پیٹر جیت گیا اور جوآن ہار گیا۔ دوڑ کے بعد بھی جوآن نے اسے جانے نہ دیا بلکہ اسے ساتھ لے گیا جہاں مارتھا کو ایک سپاہی نے گرفتار کر رکھا تھا اور مخبر عورت میگ قریب کھڑی تھی۔

''کپتان جو بڑا سفاک، سیاہ قلب اور سنگ دل آدمی تھا۔ اور لالچ کے لیے مذہب، انصاف اور قانون کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اور نہ ہی اسے کسی انسان کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ صرف مطلب پرست تھا مگر اس موقعہ پر منصف مزاج اور رحم دل بننے میں اس کی ایک خاص غرض تھی جو آگے چل کر ظاہر ہوگی۔'' (۴۷)

لزبتھ نے مارتھا کے حق میں گواہی دی جس نے نتیجے میں اسے کپتان کو گھر لے جانا پڑا اور کھانے کی دعوت دینا پڑی۔ کھانے پر سب جمع تھے۔ کپتان نے پیٹر کی خوب تعریف کی اور لزبتھ کی بھی۔ ڈرک، پیٹر اور کپتان نے کھانے کے بعد مل کر شراب پی۔

ڈرک نئے مذہب یعنی لوتھر کا پیرو تھا۔ دو سال سے وہ اس فرقہ میں شامل ہو گیا تھا۔ جوآن دولت کے لالچ میں لزبتھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور ڈرک کو رکاوٹ سمجھتا تھا۔ اس نے میگ کو بلایا اور اس سے اگلوا لیا کہ ڈرک پادری کے سامنے گناہوں کا اعتراف نہیں کرتا۔ کپتان نے پانچ سو اشرفی کا لالچ دے کر ڈرک کے خلاف دو گواہ تیار کرنے کا کہا۔ میگ نے اسے ثبوت لا کر دیا۔ کپتان نے وہ ثبوت پیش کرتے ہوئے لزبتھ کو دھمکی دی کہ اگر تم نے میرے ساتھ شادی نہ کی تو میں ڈرک کو مرتد قرار دے کر سزا دلواؤں گا۔ لزبتھ نے کپتان سے شادی کر لی جس نے اس کی ساری دولت فقط دس ماہ میں اڑا دی۔ میگ نے کپتان کے خلاف ثبوت اکٹھے کیے اور ثابت کیا کہ ہسپانیہ میں اس کی بیوی اور دو بچے ہیں۔ برانٹ نے اس سے وہ ثبوت لے لیے اور کپتان پر مقدمہ بنا کر اسے چودہ سال کی قید کرا دی۔

لزبتھ آزاد ہو گئی مگر وہ تنگ دست تھی۔ ڈرک بھی اس سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ وہ عنقریب ماں بننے والی تھی۔ ایک شام وہ خلیج ہارلیمر کی طرف چلی گئی۔ وہ پانی میں اترتی اور جوں جوں آگے بڑھتی گئی پانی اس کے سر سے نکلتا گیا۔ اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو مارتھا کی جھونپڑی میں پایا۔ وہ وہیں رہنے لگی۔ اس کا ایک بیٹا ہوا۔ مارتھا نے اسے سمندر میں غرق کرنے کو

کہا مگر لزبتھ نہ مانی۔ مارتھا نے کہا کہ اچھا اسے زندہ رہنے دو مگر اس کے ہاتھ سے کسی وقت تم پر مصیبت آئے گی۔ ڈرک ایک دن لزبتھ کے پاس آیا اور اسے شادی کی پیش کش کی۔ دونوں کی شادی ہوگئی۔ جو آن کے بیٹے کا نام ایڈرین رکھا گیا۔ ڈرک کے بیٹے کا نام فائے رکھا گیا جو اس ناول کا ہیرو ہے۔

ایڈرین نے ایک موقعہ پر برانٹ کی لڑکی کو راہزنوں سے بچایا لیکن پادری کے گھر آنے پر اعتراض کرنے پر ڈرک بھڑک اٹھا اور اسے گھر سے نکل جانے کو کہا۔ ہاتھا پائی میں ایڈرین سخت زخمی ہوگیا۔ برانٹ نے ڈرک کے نام جو خط اپنی بیٹی کے ذریعے بھجوایا تھا اس میں لکھا تھا:

''میں نے اپنے دادا اور باپ کی کمائی ہوئی دولت اس
غرض سے جمع کر رکھی ہے کہ وہ دولت میرے پیارے وطن کو
آزاد کرنے، ہالنڈ میں مذہبی آزادی قائم کرنے اور اہل
ہسپانیہ کو ہالنڈ سے مار مار کر نکال دینے میں صرف کی جائے۔
ایک ہسپانی بھی ہالنڈ میں موجود نہ رہے۔ جہاں کوئی ہسپانی
ملے وہیں اسے تہ تیغ بے دریغ کر دیا جائے۔ ظالموں نے
ہمارا خود بہانے میں کچھ کمی نہیں کی۔ لوٹیروں نے ہماری
دولت لوٹنے میں کوئی فروگذاشت نہیں کی۔ سنگ دلوں نے
ہمارے ہم وطنوں کو بھوکا مارنے میں کوئی کسر نہ
چھوڑی۔''(۴۸)

اس نے خط میں لکھا کہ ریمریو اس کے خزانے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ یا تو خزانہ محفوظ ہو جائے ورنہ سمندر میں غرق ہو جائے۔ وہ اس روپے کو ملک کی امانت تصور کرتا تھا اور اسے وطن کی آزادی پر لگانا چاہتا تھا۔ برانٹ کا خزانہ فائے، مارٹن اور مارتھا نے مل کر ایک جزیرے میں دبا دیا اور خود اس جزیرے کا نقشہ لے کر گھر آ گئے۔ ایڈرین نے لزا سے اظہار محبت کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ریمریو اور ریک نے دھوکے سے ایڈرین سے سارے راز

اگلوا لیے اور تحریر پر دستخط کرنے کو کہا۔ مارٹین اور فائے کو گرفتار کیا گیا لیکن وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ ڈرک کو قید کر لیا گیا۔ قید میں بھی ڈرک کو یہ امید تھی کہ اس کا وطن ضرور آزاد ہوگا۔ اس نے کہا

''کوئی وقت آئے گا کہ ظالم ہسپانی ہماری ایک ایک
جان کے بدلے دس دس جانیں دیں گے اور ہمارے وطن
کے لیے وہ دن بڑی خوشی اور مسرت کا ہوگا۔''(۴۹)

مارتھا نے بھی اپنی جان وطن پر قربان کر دی۔ ریمریو یعنی جوآن بھی مارا گیا۔ آخر میں فائے اور مارٹن خزانہ پرنس اورنج کے پاس لے آئے تا کہ وہ دولت ملک کو آزاد کرانے میں استعمال ہو۔ پرنس بہت خوش ہوا۔

آخر میں مترجم کا بیان ہے وہ ان محبان وطن کو سراہتا ہے اور ان کی قربانی کا نتیجہ بیان کرتا ہے:

''ناظرین لیڈن کا ڈیفنس تاریخ میں قابل یادگار ہے
جو پرنس اورنج نے جس کا نام ولیم خاموش تھا، کیا۔ ہمیں اس
کے تکرار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ پرنس
نے ہسپانیوں کو فاش شکست دی۔ ان کے جہاز غرق کر دیے
اور ملک کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑا لیا اور ہمیشہ کے لیے اسے
آزاد کر دیا۔۔۔ان سب محبّ الوطنوں کی بدولت یہ چھوٹا سا
ملک جس کی آبادی صرف چالیس لاکھ کی ہے اس وقت تک
مطلق آزاد ہے۔''(۵۰)

محبّ وطن سفری بیوی

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۶ء میں سیالکوٹ سے جبکہ دوسری بار ۱۹۱۲ء میں روز بازار سٹیم پریس امرتسر سے شائع ہوئی۔ ۱۹۱۳ء کے پنجاب گزٹ میں اس کے بارے میں درج ذیل ریمارکس تحریر کیے گئے ہیں:

The story of an unfaithful woman who happened to meet a traveller on his journey and became his wife but ultimately deserted him." (۵۱)

کہانی کے آغاز میں دکھایا گیا ہے کہ کرنل آرتھر مارٹن پیرس سے سینٹ پیٹرز برگ کو جارہا تھا۔ وہاں اس کی بیٹی تھی جس کا شوہر شادی کے چند سال بعد ایک معرکے میں مارا گیا تھا۔ اب کرنل آرتھر بیٹی کی جائیداد کا انتظام کرنے اور اسے ملنے جارہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور اپنا دونوں کا پاس حاصل کرلیا تھا لیکن پہلے وہ خود جارہا تھا کہ وہ موسم کا جائزہ لے کر بیوی کو بعد میں بلوا لے گا۔ ٹرین کے جس ڈبے میں وہ سوار تھا وہاں ایک لفٹننٹ اور کپتان آپس میں باتیں کررہے تھے کہ روسی خفیہ پولیس کا نیا اعلیٰ افسر مقرر کیا گیا ہے اور شہنشاہ کا اس پر بڑا اعتماد ہے۔ نہلسٹوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اس نے خط کتابت کے وسائل دریافت کر لیے ہیں اور ان کا سائفر بھی معلوم کرلیا ہے۔ اب سینٹ پیٹرز برگ میں ہر رات خفیہ طور پر نہلسٹ گرفتار کر کے سائبیریا بھیج دیے جاتے ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا اور سب کارروائی چپ چاپ ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ پولیس افسر نے ایسا انتظام کیا ہے کہ کوئی نہلسٹ پیرس سے جا کر روسی سرحد میں قدم رکھے تو فی الفور گرفتار کر کے سائبیریا بھیج دیا جائے۔ پھر وہ دونوں ایک عورت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں کہ تمام خفیہ پولیس اس کو پکڑنے کی کوشش میں ہے لیکن وہ ابھی تک ناکام رہے ہیں۔

کرنل آرتھر روسی سرحد پر اپنا پاس چیک کروانے کے لیے متعلقہ افسر کے پاس گیا تو ایک لیڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ وہ اپنا پاس بھول آئی ہے اور اسے بہت ضروری پہنچنا ہے۔ اگر وہ اس کو بطور بیوی متعارف کرائے تو یہ فوجی انہیں جانے دیں گے۔ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر کرنل نے ایسا ہی کیا۔ راستے میں انہیں شہزادیاں ملیں جن میں سے ایک کے ساتھ میجر ساچہ کا رشتہ طے تھا۔ وہیں خفیہ پولیس افسر بیرن فریڈرک سے ملاقات ہوئی جسے کرنل نے ریلوے کا کوئی اعلیٰ افسر سمجھا۔

سینٹ پیٹرز برگ میں کرنل آرتھر نے لیڈی کو اپنی بیوی کہہ کر متعارف کرایا۔ ایک تقریب میں لیڈی شہنشاہ روس کو اس پستول سے مارنا چاہتی تھی جو اس نے اپنے لباس میں چھپا

رکھا تھا لیکن کرنل نے اسے شراب میں نشہ آور دوا پلا دی اور اسے ہوٹل لے گیا۔ لیڈی نے اسے بتایا کہ وہ پولینڈ کی رہنے والی ہے۔ اس کے ماں باپ کو روسیوں نے ظلم کر کے مار دیا اور اب وہ زار روس اور زار شہنشاہ کی دشمن ہے۔ وہ میجر ساچہ کو دامِ الفت میں پھنسا کر اس کے ساتھ سرحد عبور کر گئی۔

اُدھر بیرن فریڈرک شک کی بنا پر پیرس سے کرنل کی بیوی کو خط لکھ کر وہاں بلا لیتا ہے۔ کرنل سمجھ داری سے کام لیتا ہے اور برین سے کہتا ہے کہ ہم دونوں ہی مجرم ہیں۔ تم مجھے آسانی سے غائب نہیں کر سکتے کیوں کہ روسی کونسلر ولسکی میرے داماد کا بڑا بھائی ہے۔ بیرن اس دھمکی سے خاموش ہو گیا۔ کرنل اپنی بیوی کے ساتھ واپس پیرس آ گیا۔ ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ تماشا گاہ میں گیا۔ وہاں اس نے لیڈی کو دیکھا اور اس سے ملا۔ اس ناول کی آخری سطور یہ ہیں:

''دل میں حیران تھا کہ کتنے آدمیوں کی جان اور عزت
لیڈی اپنے وطن پر قربان کرے گی۔ اور انجام کار میری سفری
بی بی کا کیا حشر ہوگا۔'' (۵۲)

اس ناول میں لیڈی کی ذہانت، اس کے حسن اور حب وطن کے جذبے کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کرنل آرتھر مارٹن کو پتا چلا کہ وہ باغی ہے تو اس نے اس کا پول کھول دینے کا فیصلہ کیا لیکن لیڈی نے اسے اس امر سے باز رکھا اور کہا:

''ہاں ذرا توجہ سے سنو۔ تم اب میرے برابر ہی مجرم
بنتے ہو۔ تم نے خود جھوٹے پاس پر مجھے روسی سرحد میں داخل
کیا۔ تم نے روسی کرنل کے سامنے مجھے اپنی بیوی کہا۔ تم نے
ولنا کے ہوٹل میں اپنے قلم سے مجھے اپنی بیوی لکھا۔ تم نے
پولینڈ کی شاہزادیوں کے سامنے مجھے اپنی بیوی تسلیم کیا۔ تم
نے خود اپنے رشتہ دار ولسکی سے میری ملاقات کرائی اور سب
سے زیادہ میرے سفری شوہر تم نے تیسرے سیکشن کے افسر
خفیہ پولیس کے چیف سے میری ملاقات کرائی۔'' (۵۳)

اپنے وطن کی آزادی کے لیے وہ مرمٹنے کو تیار ہے۔ وہ تمام صعوبتیں محض اپنے وطن کی خاطر

برداشت کرتی ہے۔ اپنا سکون، آرام، جان، مال اور یہاں تک کہ عزت بھی قربان کرنے کو تیار تھی۔ اس نے کرنل کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا:

''میری جان میرے ملک کے لیے ہے۔ جہاں اتنے آدمی ملک کے لیے شہید ہوئے۔ اگر میں بھی شہید ہو جاؤں گی تو کیا پروا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے یہ صعوبتیں اٹھا رہی ہوں۔''(۵۴)

ظالمانہ حکومت کا خاتمہ یعنی زاریت کا زوال

۱۰۸ صفحات کی یہ کتاب سی جوبرٹ کی تصنیف "Secrets Societies and the end of despotism in Russia" کا ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۸ء میں قومی پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں روس کے حکمرانوں کے ظلم و ستم کو مختلف واقعات سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ روس کی انقلاب پسند پارٹی کی حمایت میں دلائل دیے گئے ہیں۔ دیباچہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''پہلی کتاب میں جو میں نے روس پر لکھی۔ میں نے روسی اخبارات اور فسانوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ دوسری کتاب (روس کی موجودہ حالت) میں میں نے زاریت یعنی زار روس کی حکومت کا راز آشکارا کیا۔ اور لوگوں کو صاف دکھا دیا کہ روس پر کس طرز سے حکومت کی جا رہی ہے اور اس ظالمانہ کل کا چلانے والے کون ہیں۔ اس تیسری کتاب میں میں نے نئے حالات اور صورتیں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن کی وجہ سے اوس کے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ لوگ متفق ہو کر زار کی حکومت سے امان چاہتے اور روس میں قانونی حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔''(۵۵)

دنیا میں امن وامان کے قیام کے لیے وہ زاریت کے خاتمے اور انقلاب پسند پارٹی کی حمایت پر زور دیتے ہیں اور دیباچے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ جو لوگ روس کے خیر خواہ اور دوست ہیں۔ وہ اس پارٹی کے بھی خیر خواہ اور دوست ہیں کیونکہ نہ صرف روس بلکہ تمام دنیا میں امن اور صلح قائم رکھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ زاریت کا خاتمہ ہو جائے۔

روس میں مسلسل ظلم اور ظالم حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہیبت ناک آئیون سے لے کر پیٹر اعظم تک اور پیٹر اعظم سے لے کر نکولس دوم تک ظلم و ستم کی تلوار برابر چلتی آئی ہے۔''(۵۶)

روسی سپاہیوں کے ظلم وستم کا بیان بھی پر تاثیر ہے۔

''۲۳ جنوری ۱۹۰۵ء کی صبح کو مہذب دنیا یہ خبر پڑھ کر کانپ اٹھی کہ سینٹ پیٹرز برگ میں روسی سپاہیوں نے غریب رعایا کے خون کی ندیاں بہا دیں۔۔۔۔ یہ تو سرکاری رپورٹ تھی مگر ممالک غیر کے اخبارات کے نامہ نگاروں نے صحیح رپورٹ ارسال کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار آدمی بے رحمی سے قتل کیے گئے اور خون کی ندیاں بہہ گئیں۔''(۵۷)

درج ذیل کتب کے حوالے پنجاب گزٹ اور طبع کی گئی کتب کے آخر میں اشتہارات کی صورت میں ملتے ہیں۔

میری بیماری کا تحفہ یعنی یورپین تہذیب کی درگت

Translation of a Chinese work on the European Social Customs. (۵۸)

قومی پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء میں شائع کی گئی۔

ہندوستان کی کہانی انگریزوں کی زبانی یعنی ہندوستان میں بدامنی کے اسباب

The causes of unrest in India, as explained by an Englishman.(۵۹)

قومی پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔

خوشحال ہندوستان

An Urdu Translation of Mr. Digby's"The Prosperous British India" which proves by facts and figures that India is sinking in the scale of prosperity under the British Raj. (۶۰)

۱۹۰۷ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

جنٹل مین چور

ایک چور کا قصہ جو ایک شریف آدمی کے بھیس میں تھا۔ پنجاب پریس سیالکوٹ سے یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔(۶۱)

خونی وزیر

یہ ایک وزیر کی کہانی ہے ایک خوب صورت لیڈی کو مارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ یہ کتاب روز بازار سٹیم پریس امرتسر سے ۱۹۱۳ء میں منشی فیض علی نے شائع کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۷ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع کیا گیا تھا۔(۶۲)

حب الوطنی کی عجیب مثال

A wonderful example of love for one's country or how the Cubans won independence through the patriotism of a brave lady who liberated her brother from prison by personating him. (۶۳)

یہ کتاب قومی پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔

فرضی بی بی ومیاں بی بی کا ڈراما

یہ کتاب روز بازار سٹیم پریس امرتسر سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔ پنجاب گزٹ میں اس کے موضوع کے متعلق درج ذیل سطور تحریر ہیں:

Story of a lord in England who hired an English woman to passfor his wife in order to deceive his uncle who way always pressing him for marriage.

(2) On the momentary pleasures of wealth.

(3) On a quarrelsome wife, etc. (۶۴)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1907ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع کیا گیا تھا۔

حمائل شریف مترجم

۱۸۹۴ء میں قرآن پاک کا اردو ترجمہ پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع کیا گیا۔

The Holy Quran translated, Arabic and Urdu. (۶۵)

حمائل شریف مترجم، پاکٹ ایڈیشن

قرآن پاک (پاکٹ ایڈیشن) اردو ترجمے کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے چھاپا گیا۔ (۶۶)

طبع زاد تصانیف:

تاریخ اسلام۔عرب کا جغرافیہ

۵۶ صفحات کے اس کتابچے میں غلام قادر فصیح نے دیباچے میں نبی اکرمؐ کی اصلاحات وفتوحات کو مشکلات کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ان کا اندازِ بیان خطیبانہ اور پر جوش ہے۔وہ دلائل کے ذریعے اپنی بات منواتے ہیں۔ابتدا میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں جس قدر انبیا اور رسل جس قدر مصلحین اور فاتحین گزر چکے ہیں کسی نے بھی اپنے مقاصد میں وہ کامیابی و ظفر، فتح ونصرت حاصل نہیں کی جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔''(۶۷)

فصیح نے صرف مسلمانوں کا جوش وجذبہ اور عقیدت ہی ملحوظ نہیں رکھا بلکہ غیر مسلموں کی عقیدت کو بھی بیان کیا ہے۔

''جو لوگ مسلمان نہیں وہ بھی جب آپؐ کی اصلاح قومی اور فتح ملکی اور خارق عادت ترقی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو کمال حیرت میں بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی آپؐ کی اصلاح آپؐ کی کامیابی کی نظیر کسی فاتح اور کسی مصلح کی زندگی میں ہرگز ہرگز نہیں مل سکتی۔حتیٰ کہ مسٹر کارلایل مشہور و معروف فلاسفر نے بھی باوجود عیسائی ہونے کے اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں تمام مرسلین اور مصلحین میں سے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو انتخاب کر کے اپنی کتاب کو زیب وزینت بخشی ہے۔''(۶۸)

نبی اکرم ﷺ کے حالات اور مشکلات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان حالات میں آپ ﷺ کی کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے۔عقیدت کا ایک دریا ہے جس سے الفاظ کے موتی نکل رہے ہیں۔روانی اور سلاست ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا چلا جاتا ہے۔

''تعجب کی بات ہے کہ کسی مکتب میں ایک حرف تک نہ پڑھا نہ کبھی لکھنا سیکھا نہ اس کے پاس کچھ مال وزر ہے جس

کے بھروسے پر وہ کوئی کام کر کے سرسبزی کی امید رکھے۔
غرضیکہ دنیاداروں سے ناامید اور دنیا نے اس کو چھوڑا ہوا ہے
مگر ایک اللہ اس کا حامی اور اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑا
ہوا ہے۔''(۶۹)

۴۰ سال کی عمر میں نبی اکرم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں جاہل امی اور اکھڑ قوم نے آپ ﷺ کے پیغام کو نہ صرف رد کیا بلکہ ہنسی، ٹھٹھ، طعن و تشنیع، ملامت و دلخراشیوں سے آپ ﷺ کو تنگ کرنا شروع کیا۔ شعب ابی طالب میں محصور رہنا پڑا۔ مدینہ کے چند سال کے بعد فاتح مکہ کی صورت میں آپ ﷺ واپس آتے ہیں۔ آپ ﷺ کی روم و ایران کے بارے میں کی گئی پیشین گوئیاں سچ ثابت ہوئیں۔ دیباچے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''چونکہ شروع میں اس افضل البشر دنیا کے سردار
حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی مقدس زندگی کے واقعات تبرکاً
درج کیے جائیں گے جو مقدس مذہب اسلام کے بانی ہیں اس
لیے اس نبی عربی کے وطن یعنی ملک عرب کا جغرافیہ کسی قدر
بیان کیا جاتا ہے تاکہ حالات کے سمجھنے میں ناظرین کو مدد
ملے۔''(۷۰)

عرب کا جغرافیہ، عرب کے شہروں کا تفصیلی حال، تاریخی مقامات، عرب کی آزادی، اقوام عرب، زمانہ جاہلیت، عورتیں، رسم حج، جنگ و جدل، مذاہب، بت پرستی، لامذہبی، مذہب صابی، یہودی، عیسائی کے عنوانات کے تحت دلچسپ انداز میں عرب کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عرب سے متعلق تمام معلومات کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ مولف کا مقصد ان معلومات کو عام کرنا تھا اس لیے اس کی زبان سادہ ہے جو عام قاری کی فہم کے مطابق ہو۔ ''عرب کا جغرافیہ'' کے عنوان کے تحت ابتدا میں لکھتے ہیں:

''عرب براعظم ایشیا میں ایک جزیرہ نما ہے۔ اس کا
اوپر کا حصہ خشکی سے ملا ہوا ہے اور باقی تین طرف سمندر

ہے۔''(۷۱)

عرب کی پیداوار کا احوال اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''عرب کے جو حصے قدرتی زرخیز ہیں وہ حد وسطی کے جنوب کی طرف کوہستانی حصہ میں واقع ہیں ۔ اس کا نام العرب الاخضر ہرا بھرا عرب رکھا ہوا ہے۔ انگور، انجیر، ناسپاتی ،بادام وغیرہ پھیل پیدا ہوتے ہیں ۔قہوہ اور کھجور یہاں کے برابر نہیں ہوتا۔ اہل عرب کا گزارہ زیادہ تر کھجور اور جوار پر ہے۔''(۷۲)

سموم اور سراب کے ذیلی عنوان کے تحت دلچسپ اور عبرت انگیز انداز میں وہاں کی گرم ہوا اور سراب کا ذکر کیا گیا ہے۔عرب کو پانچ صوبوں میں منقسم بتایا گیا ہے جس میں یمن ،حجاز، تھامہ،نجد اور یمامہ شامل ہیں۔

زمانہ جاہلیت کی رسومات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو بڑی دلچسپ ہیں:

''جب کوئی شخص سفر کا عزم کرتا تھا اور اسے یہ خیال ہوتا کہ دیکھیے میری بی بی میرے بعد پاک دامن اور ایماندار رہتی ہے یا نہیں تو اس کے معلوم کرنے کے لیے درخت میں تاگا باندھا جاتا اور جب پھر لوٹ کر آتا تو اسے دیکھتا کہ اگر بدستور اسے بندھا ہوا پاتا تو سمجھتا کہ میری بیوی پاک دامنی اور ایمانداری سے رہی ہے۔اور اگر اسے بدستور بندھا ہوا نہ پاتا تو گمان کرتا کہ ضرور اس نے خیانت کی ہے۔''(۷۳)

توہمات پر عربوں کا بہت یقین تھا۔مختلف پرندوں اور جانوروں کے حوالے سے مختلف عقیدے تھے۔اسی طرح روحوں کا اثر اس زمانہ میں بہت تسلیم کیا جاتا تھا۔مرنے والا شخص اپنے دشمن سے کہہ جاتا تھا کہ میں آکر تم کو خوب دق کروں گا۔اس وہم کا دشمن پر اس قدر اثر ہوتا کہ اگر وہ اتفاقیہ بیمار بھی ہوتا تو یہی خیال کرتا کہ اس شخص کی روح چڑیل ہو کر مجھے چمٹ گئی ہے۔اس قسم کے

توہمات وخرافات میں خلق خدا کا ستیاناس ہو رہا تھا۔(۷۴)

شعر وشاعری کے حوالے سے عربوں کا اعتقاد بڑا دلچسپ تھا۔ان کے مطابق ہر شاعر کے اختیار میں ایک جن رہتا ہے اور جس قدر بڑا شاعر ہوتا ہے اسی قدر زبردست جن اس کے زیر حکومت رہتا ہے۔(۷۵)

پانچ نمازوں کی طرح شراب نوشی کے اوقات خمسہ معین تھے۔(۷۶)

بابا نانک کی سوانح عمری

''بابا نانک صاحب'' ظفر المطابع سیالکوٹ سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔۱۶ صفحات کے اس کتابچے میں بابا نانک صاحب کے حالات اور کچھ واقعات پیش کیے گئے ہیں۔مصنف نے حالات لکھتے ہوئے اندھا دھند تقلید سے کام نہیں لیا بلکہ دلائل اور معلومات کی بنا پر عقلی فیصلے صاد کیے ہیں۔ابتدا ہی سے اس تحقیق اور دقت نظری کا پتا چلتا ہے۔

> ''بابا نانک صاحب کی جنم ساکھیاں اس قدر مختلف ہیں
> اور اس قدر مبالغہ سے بھری ہوئی ہیں کہ کسی ایک کو بھی ان کی
> سچی اور صحیح جنم ساکھی نہیں کہا جا سکتا۔''(۷۷)

ان جنم ساکھیوں میں مبالغے کی بھرمار ہے۔اس مبالغے کو مصنف عقیدت تصور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''مگر یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ کیوں اس قدر مبالغہ
> سے بابا نانک کی جنم ساکھیاں لکھی گئی ہیں کیوں کہ بعض
> مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے مسلمان فقراء کے حالات اس
> قدر مبالغے سے لکھے ہیں اور وہ بیان بھی کرتے ہیں تو اسی قدر
> مبالغہ سے بیان کرتے ہیں۔''(۷۸)

بابا نانک کالو کھتری کے ہاں پیدا ہوئے۔ان کا نام نانک رکھا گیا۔ان کے اطوار ابتدا ہی سے دیگر ہندو لڑکوں سے مختلف تھے۔تعلیم کے لیے پہلے تو ایک پنڈت کے سپرد کیا گیا اور بعد ازاں ایک مسلمان معلم کے مکتب میں بھیجا گیا۔ان کے مذہبی خیالات چھوٹی عمر ہی میں اپنے دیگر

ہم مذہبوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ بابا نانک کو بچپن ہی سے کھانے پینے کی کم عادت تھی یا یوں کہیے کہ انہوں نے نفس کشی بچپن سے ہی شروع کر دی۔

ان کے والد نے انہیں مختلف کاموں پر لگایا مگر ان کی دلچسپی دنیا کے کاموں میں نہ تھی بلکہ وہ فقیروں اور سادھوؤں کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔ بابا نانک کی شادی ہوئی اور ان کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے مصنف یہ فیصلہ دیتے ہیں:

''مگر بابا نانک نہ تو اچھے شوہر ہی تھے اور نہ اچھے باپ ہی تھے۔ بی بی کے ساتھ ان کی محبت نہ تھی اور لڑکوں سے بھی کچھ الفت نہ تھی۔ کیوں کہ ابھی ان کے بچے چھوٹے ہی تھے کہ وہ انہیں چھوڑ چھاڑ کر جنگل میں چلے گئے۔''(۷۹)

بابا نانک اگرچہ ہندو تھے لیکن وہ بت پرستی کو بہت برا سمجھتے تھے۔ انہوں نے بت پرستی کے خلاف تعلیمات دیں۔ اس بت شکن تعلیمات سے فصیح نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود بت پرستی کے مخالف تھے اور اسلام کے ثنا خواں تھے۔ ان کی تقریر میں جہاں وہ بت پرستی کے مخالف چلتے ہیں ایک کلمہ بھی تو اسلام کے خلاف نہیں نکلا۔ اور جہاں کہیں وہ مسلمان زاہدوں اور فقیروں سے ملے ہیں بڑی ہی دل بستگی سے ملے ہیں۔''(۸۰)

بابا نانک نے ۱۵۹۶ء میں موضع کرتار پور میں وفات پائی۔ آخر میں غلام قادر فصیح لکھتے ہیں:

''کوئی شبہ نہیں کہ وہ بڑے ہی پاکباز اور خدا پرست تھے اور انہوں نے اپنے مقلدوں کے روبرو ایک ایسا نمونہ زندگی پیش کیا جس پر کوئی شخص چلنے کی بہ مشکل جرأت کر سکتا ہے۔''(۸۱)

سری رام کرشن پرمہنس اور ہندوستان کی بیداری

یہ کتاب ہندوستان سٹیم پریس لاہور سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ۱۴۶ صفحات کی اس

کتاب میں غلام قادر فصیح نے سری رام کرشن پرمہنس کے حالات اور اقوال بیان کیے ہیں۔ پہلے چار صفحات میں ''عرض'' کے عنوان سے سری رام کرشن کے نام اور حالات سے دلچسپی کی بنیاد اور اسباب کو بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق پرمہنس جی کی تعلیم صوفیائے کرام اور دیگر مذاہب کی اصل تعلیم کے بالکل مطابق ہے۔ ص ۶ سے ص ۲۴ تک دیباچہ تحریر کیا ہے۔ غلام قادر فصیح کی کسی کتاب کا دیباچہ اتنا طویل نہیں ہے بلکہ بہت سی کتابوں میں تو دیباچے کا تکلف ہی نہیں کیا گیا اور براہ راست اصل موضوع شروع کر دیا گیا ہے۔ دراصل انہوں نے اپنے نظریات وافکار کو پرمہنس جی کے کردار کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ فصیح صاحب ایک معزز کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی طور پر ان کا خاندان دیندار تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ ہر بلا تعصب ہر ایک سے ملتے رہے۔ یہی غیر متعصب رویہ ان کے اس دیباچے میں ملتا ہے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر ایک قوم بننے کا سبق دیا ہے۔ وطنیت کا یہ تصور انہوں نے سری رام کرشن کے حالات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ ایک مبصر اور پر جوش مقرر کی طرح اپنے دلائل دیتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا آہنگ بلند اور لہجہ خطابیہ ہے۔ دیباچہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''پرمہنس جی میں ایک بڑی خصوصیت تھی جس کا میں اس دیباچہ میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ تھی کہ آپ نے ہر ایک مذہب کو سچا قرار دیا اور ہر ایک مذہب وملت میں داخل ہو کر اور الگ الگ طریقہ سے خدا کی عبادت کر کے اس نتیجے پر پہونچے کہ ہر ایک مذہب میں خدا تک پہونچنے کا راستہ موجود ہے اور سب مذاہب مختلف راستے ہیں اور اس ایک ہی صداقت تک پہونچتے ہیں اور سب ایک ہی خدا کی مختلف صورتیں ہیں۔'' (۸۲)

وہ اپنے مذہب سے ہٹنے کا نہیں کہتے بلکہ اسی راستے پر چلتے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پرمہنس جی کا کہنا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے مذہب پر پختہ ایمان کے ساتھ رہنا اور چلنا چاہیے مگر اپنے مذہب کے اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ جب وہ مختلف طریق سے اپنے اپنے اعلیٰ

مقصد کو پہنچیں گے تو وہاں پہنچ کر وہ معلوم کر لیں گے کہ مختلف راستوں سے وہ ایک ہی مقام پر پہنچے ہیں۔

غلام قادر فصیح ہندوستان میں ہندو مسلمان کے جھگڑوں سے دق ہیں۔ جب وہ دونوں اقوام کو سمجھاتے ہیں تو اس میں مصالحانہ انداز تو پایا جاتا ہے لیکن ایک ہلکا سا طنز بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔ اردو ہندی جھگڑے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہاں اردو ہندی کا جھگڑا چل رہا ہے۔ ایک کہتا ہے اردو کو رونق دی جائے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہندی رائج کی جائے۔ میں پوچھتا ہوں فریقین کو دونوں زبانیں سیکھنے میں کیا موت پیش آتی ہے؟ ہندو مدارس ہیں تو اردو کو نزدیک نہیں آنے دیتے اور اسلامیہ مدارس ہیں تو ہندی کو اندر نہیں پھٹکنے دیتے۔ کیا مصیبت پڑتی ہے اگر ہندو مدارس میں ہندی کے ساتھ اردو بھی پڑھا جائے؟ کیا آفت پڑتی ہے اگر اسلامیہ مدارس میں اردو کے ساتھ ہندی بھی سکھائی جائے؟ اور کیا دقت پیش آتی ہے اگر سرکاری مدارس میں اردو ہندی دونوں زبانوں کی تعلیم دی جائے؟ کیا نقص پیدا ہوتا ہے اگر اسلامی مدارس میں ہندو الٰہیات بھی پڑھا جائے؟ اور کیا حرج ہوتا ہے اگر ہندو مدارس میں اسلامی الٰہیات کی بھی تعلیم دی جائے؟''(۸۳)

وہ اس تعصب کا ذمہ دار والدین کو قرار دیتے ہیں کہ والدین بغض اور عداوت سے اپنی زندگی کو تو تلخ کر ہی لیتے ہیں لیکن اپنی اولاد کی زندگی کیوں تلخ کرتے ہیں۔

> ''کیا ماں باپ کا یہی فرض ہے کہ اپنے بچوں کی زندگی تلخ کر دیں؟ ان کے دلوں میں بغض و عداوت کا بیج بوئیں؟

اور بجائے باہم پیار و محبت کے رہنے کے فتنہ و فساد میں پڑے
رہ کر اپنی تخریب اور بربادی کے درپے رہیں؟'' (۸۴)

اسی طرح مذہبی تنافر کو بھی بیان کرتے ہیں:

''ایک نے بانگ دے لی۔ دوسرے نے ناقوس بجا
لیا۔ بانگ سے کیوں ہندو کے کان پھٹتے ہیں۔ اور ناقوس
سے کیوں مسلمان کے کان بہرے ہوتے ہیں۔'' (۸۵)

اپنے پیغام کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''قوم پرور بنو۔ یا یوں کہو کہ انسان صورت حیوان
سیرت مت بنو۔ بلکہ ملک پرور اور وطن پرست بنو۔ یعنی
انسان صورت انسان سیرت بنو۔ تمام اقوام ہند کو ایک قوم
سمجھو۔ ہند کے تمام رہنے والوں کو وطن بھائی سمجھو
۔۔۔۔۔ یاد رکھو جس کو وطن کے ساتھ محبت نہیں۔ اس کا
ایمان بھی کوئی نہیں۔ وطن کو پیار کرو۔ ہم وطنوں کو پیار کرو اور
وطن کی چیزوں کو پیار کرو۔'' (۸۶)

ص ۲۵ سے ص ۵۸ تک سری رام کرشن کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے والدین کی سادگی، قناعت اور راست بازی کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک دن ان کے والد پنڈت خودی رام کو گدہادر جی (وشنو دیوتا) نے بشارت دی کہ ''میں تمہارے گھر جنم لوں گا'' ۲۰ فروری ۱۸۳۵ء کو ان کے گھر لڑکا ہوا جس کا نام وشنو کے نام پر گدہادر رکھا جسے پیار سے گدلا کہتے تھے۔ محلے کی سب عورتوں میں گدلا مقبول تھا۔ اس بچے کا حافظہ بلا کا تیز تھا۔ بچپن ہی سے مورتی پوجا کا بہت شوق تھا۔ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ کی مشہور اور مالدار رانی راس منی نے گنگا کے کنارے دکشنیشر مقام پر عالیشان مندر کالی دیوی کا تعمیر کرایا۔ بھائی کے اصرار پر گدلا نے پجاری بننا منظور کر لیا۔ اور اب گدالے کے بجائے اس کا نام رام کرشن پڑ گیا۔ رام کرشن اس ذوق و شوق سے گیت گاتا کہ گویا

کالی دیوی سامنے ہے۔ وجد میں آکر وہ پکارتے

''اے ماتا (ماں) کرم کراور دیدار دے۔ مجھے نہ دھن چاہیے نہ عزت نہ شہرت۔ مجھے کچھ نہ چاہیے بس ایک تیرے دیدار کی آرزو ہے۔ میری آرزو پوری کر۔'' (۸۷)

رام کرشن گھنٹوں وجد میں رہنے لگے۔ کبھی پھولوں کی جو مالا کالی دیوی کے لیے بناتے وہ اپنے گلے میں ڈال لیتے گویا کالی ماتا ان میں بس رہی ہے۔

''ہر وقت ماں ماں پکارتے اور یہی کہتے کہ ماں مجھے تو آپ ہی تعلیم دے۔ مجھے تو آپ ہی سکھا۔ میں اور کسی آدمی سے تعلیم نہیں لوں گا۔ نہ کسی سے کچھ سیکھوں گا۔ بس مجھے تو ہی کافی ہے۔ مجھے درشن دے۔ اور مجھ پر رحم کر۔ مجھے اپنی گودی میں لے لے اور مجھے پیار کر۔ بس میرا جو کچھ ہے تو ہی تو ہے۔'' (۸۸)

انہوں نے اپنی انا کو مارنے کی مشق شروع کی۔ وہ بار بار کہتے کہ اے ماں میرے دل سے یہ خیال دور کر کہ میں اونچی ذات کا برہمن ہوں اور دوسرے لوگ شودر یا نیچ ذات کے ہیں۔ میرے دل میں ڈال دے کہ میں ان سے بھی چھوٹا ہوں اور نیچوں کا نیچ ہوں۔ یہ نہ صرف وہ منہ سے کہتے بلکہ عملاً جھاڑو لے کر مکان صاف کرتے۔

ایک بار وجد میں اس قدر غرق ہوئے کہ چھ مہینے تک بے ہوش پڑے رہے۔ ایک سادھو نے انہیں پہچانا۔ وہ ان کے شانوں پر سوٹے مار کر انہیں ذرا ہوش میں لاتا اور کوشش کر کے بمشکل تھوڑا تھوڑا کھانا ان کے منہ میں ڈالتا۔ ایک بڑا سنیاسی طوطا پوری انہیں سنیاس دیا اور یوگ بھاس (حبس دم) سکھانے لگا۔ سری رام کرشن نے تین دن میں اس میں کمال حاصل کر لیا۔ اس پر طوطا پوری نے متعجب ہو کر کہا کہ جو بات میں نے چالیس سال میں حاصل کی وہ آپ نے تین دن میں پالی۔ میں آپ کو اپنا شاگرد نہیں سمجھ سکتا بلکہ آپ تو میرے بھی استاد ہو اور آپ سچ مچ پرہنس ہو۔ اس وقت سے لوگ سری رام کرشن کو پرہنس کہنے لگے۔

سری رام کرشن میں بچوں کی سی سادگی اور معصومیت موجود تھی۔ بچوں کی طرح بے چین ہو کر کبھی کبھی روٹی مانگتے اور نئی چیز کو دیکھنے کے لیے بچوں کی طرح بے چین ہو جاتے۔ ہر مذہب اور ہر ملت کے لوگ بڑے اشتیاق کے ساتھ ان کی خدمت میں آتے اور آب حیات پی کر جاتے۔ جب آپ مذہب اور فلسفے کے بڑے دقیق اور پیچیدہ مسائل اور اعلیٰ صداقتیں نہایت سادہ زبان میں بیان کر کے ان کے ذہن نشین کر دیتے تو وہ عش عش کر اٹھتے۔

سری رام کرشن جلال و جمال کا حسین امتزاج تھے۔ انسانی حالت میں بڑے عاجز و منکسر تھے لیکن عالم الوہیت میں ان کی حالت بدل جاتی۔ اس وقت کہتے کہ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں اور میں ہمہ دان ہوں۔ میں جو چاہوں کسی کو بخش سکتا ہوں۔ میں ہی رام ہوں۔ میں ہی کرشن ہوں۔ میں ہی بدھا ہوں۔ میں ہی مسیح ہوں۔ اور میں وہی ایک ہوں جو اب رام کرشن کے نام سے سے پیدا ہوں۔ (۸۹)

پرمہنس جی معجزے دکھانے کے ہرگز شائق نہ تھے مگر خود بخود ان کی روحانی طاقتیں لوگوں پر ظاہر ہوتی رہتی تھیں۔ ایک عجیب طاقت ان میں یہ تھی کہ وہ کسی انسان کا جسم چھو کر اس کے خیالات بدل دیتے تھے۔

۱۸۸۵ء میں ان کے حلق میں زخم ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس بات کی تاکید کی کہ پرمہنس جی کچھ دن بولنا بند کر دیں مگر جب کبھی حق کا کوئی پیاسا آتا وہ بولنا شروع کر دیتے۔ لوگ بھی ان کے ایک ایک لفظ پر جان دیتے تھے۔ اس طرح حلق کا زخم اچھا ہونے کے بجائے بڑھتا گیا۔ آخر ۱۶ اگست ۱۸۸۶ء کو آپ سمادھی (وجد) میں گئے تو پھر واپس نہ آئے۔

ص ۵۹ سے آخر تک پرمہنس سری رام کرشن جی کے اقوال یا ملفوظات درج کیے گئے ہیں۔ کچھ واقعات و حکایات کے ذریعے، کچھ براہ راست اقوال میں اور کچھ میں سوال جواب کے ذریعے اخلاق و حکمت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان سب میں جو چیز بہت واضح ہے وہ یہ کہ ہر مذہب کا راستہ بالآخر ایک ہستی تک پہنچتا ہے چاہے ہم اسے بھگوان کہیں، مسیح کہیں یا خدا۔ ذیل میں ان کے چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

''سوال: اگر ایک مذہب کا خدا ایک ہے تو پھر کیا سبب

ہے کہ مختلف مذاہب کے معتقد خدا کو مختلف رنگ میں دکھاتے ہیں؟

جواب: خدا تو ایک ہی ہے مگر اس کی حالتیں مختلف ہیں۔ جیسے کہ گھر کا مالک تو ایک ہی ہے مگر کنبے میں سے کسی کا باپ ہے، کسی کا بھائی اور کسی کا شوہر۔ اور ہر ایک اس کو اس رشتہ کے لحاظ سے علیحدہ نام سے پکارتا ہے۔ اسی طرح ایک خدا کو مختلف ناموں سے پکارا اور مختلف رنگوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک عابد اس کو اس شکل یا حالت میں بیان کرتا ہے جس میں اس نے اس کو دیکھا ہے۔'' (۹۰)

''جیسے کہ چاند ہر ایک بچہ کا ماموں ہے۔ اسی طرح خدا تمام انسانوں کا باپ اور راہنما ہے۔'' (۹۱)

جس پیالہ میں لسن کا نچوڑ رکھ دو۔ خواہ اس کو کتنا ہی صاف کرو۔ لسن کی بو اس میں سے نہیں جاتی۔ یہی حال انانیت کا ہے۔ یہ انسان کے اندر سے باتمام زائل نہیں ہو سکتی۔'' (۹۲)

''سوال: دنیا کی کیا مثال ہے؟

جواب: دنیا آنولہ کی مثل ہے جس میں تخم اور چھلکا بہت ہوتا ہے۔ مگر گری تھوڑی ہوتی ہے اور اس کے زیادہ کھانے سے قولنج کا درد پیدا ہوتا ہے۔'' (۹۳)

ذخیرہ فیروزی

اس کتاب میں پہلے علم عروض کا بیان ہے پھر علم معانی کا۔ علم بیان یعنی تشبیہ و استعارات، اس کے بعد علم بدیع یعنی صنائع و بدائع بعد ازاں اردو زبان کے محاورات اور ضرب الامثال درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۹۴)

تاریخ اسلام:

چار جلدوں میں ''تاریخ اسلام'' پہلے پہل پمفلٹوں کی صورت میں شائع کی گئی۔ یہ تاریخ غلام قادر فصیح کے جاری کردہ رسالے ''تاریخ اسلام'' میں بھی شائع ہوتی رہی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر کتابی صورت میں شائع کی گئی۔ روز بازار سٹیم پریس امرتسر سے منشی فیض علی نے ۱۹۱۲ء۔۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں شیخ مبارک علی نے اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے شائع کی۔

جلد اول

اس جلد میں جنگ بدر سے جنگ یرموک تک کے حالات شامل ہیں۔

جلد دوم

اس جلد میں فتح عراق تک کا حصہ شامل ہے۔

جلد سوم

تیسری جلد میں فتح عراق سے شہادت حضرت عمر تک کا حصہ شامل ہے۔

جلد چہارم

جلد چہارم حضرت عمرؓ سے لے کر شہادت حضرت علیؓ پر ختم ہوتی ہے۔

منشی فیض علی نے ہر جلد کے آغاز میں یہ نوٹ دیا ہے کہ ایک وقت تھا مسلمان فاتحین کی

جانبازی اور جہانداری کا سکہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا اور ان کی آبدار تلوار کی چمک سے یورپ لرزتا تھا۔ اور اب یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کے زیرنگین علاقوں پر عیسائی قبضہ کرتے چلے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کی اطاعت اور اپنی شاندار تاریخ کو بھلا دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ تمہاری ہستی معرض خطر میں ہے۔ دنیا کی قومیں تمہیں مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اپنی شاندار تاریخ اور صالحین کے کارنامے دیکھ کر ہوش میں آؤ کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ تمہارا مستقبل اس وقت تک شاندار نہیں ہوسکتا جب تک تم کو یہ معلوم نہ ہو کہ تمہارا ماضی کس قدر شاندار تھا۔

فصیح صاحب مرحوم نے اس خطرناک کمی کو محسوس کیا اور اردو زبان میں تحقیق اور دماغ سوزی سے تاریخ اسلام لکھی۔ اس کے مطالعہ سے دماغ منور ہوتے ہیں اور دلوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہو کر رگوں میں خون کو تحریک ہوتی ہے۔ اردو زبان میں آج تک ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ آپ کا قومی فرض ہے کہ خود پڑھو، اولاد کو پڑھاؤ اور پھر دیکھو کہ آنے والی نسلیں کس طرح قرون اولیٰ کے رنگ میں رنگین ہو کر فخرِ اسلام ہوتی ہیں۔ (۹۵)

منشی غلام قادر فصیح نے تاریخ اسلام نہایت محنت، تحقیق اور دماغ سوزی سے نئے انداز اور جدید طرز پر لکھی۔ زبان شستہ و شگفتہ اور طرز بیان دلچسپ و دلکش ہے۔ فتح شام و عراق پر جس دلآویز اور بدیع المثال انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ فصیح صاحب کی خصوصیات ہیں۔ ایران کی ابتدائی تاریخ اور فراعنہ مصر کے حالات نہایت اچھے پیرایہ میں درج کیے گئے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید (سیف اللہ)، عبداللہ بن جراح (فاتح شام)، عمرو بن عاص (فاتح مصر) اور عبداللہ بن زبیر (فاتح طرابلس) کے کارنامے نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

ایرانیوں اور رومیوں کی طاقت کا حال بیان کیا گیا ہے تو الفاظ کا انتخاب عالمانہ نہیں بلکہ سادہ ہے کیونکہ ان کا مخاطب علماء نہیں بلکہ عوام تھے۔

> ''ظہور اسلام کے وقت دنیا بھر میں صرف یہ دو سلطنتیں
> تھیں جو ایک دوسرے کا جواب تھیں اور کوئی طاقت ان کے
> ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مغرب میں رومیوں کا ڈنکا بج رہا

تھا اور مشرق میں ایرانیوں کا طوطی بول رہا تھا گویا مغرب اور مشرق کو ان دونوں نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔ اگر رومیوں نے کہیں منہ کی کھائی تو ضرور ایرانیوں سے اور اگر ایرانیوں کا کسی نے گلا دبایا تو صرف رومیوں نے۔ اور کوئی قوم ان کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکتی تھی۔''(۹۶)

سعد بن ابی وقاص کی سیرت و کردار کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سعد بن ابی وقاص بڑا شریف نسب اور آنحضرت صلعم کی والدہ مرحومہ کا بھتیجا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے اسلام قبول کیا جبکہ اسلامی جماعت کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہ تھی۔ وہ تیر بنایا کرتا تھا اور تیر اندازی میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اسلام میں جس شخص نے ایک مشرک کا خون گرایا وہ سعد بن ابی وقاص تھا۔''(۹۷)

اس تاریخ میں یورپین مورخین کے حوالے بھی دیے گئے ہیں اور ان کی غلط فہمیوں کو بھی رفع کیا گیا ہے۔ خلفائے عظام پر علیحدہ علیحدہ ریویو درج کیے گئے ہیں۔

''تاریخ اسلام'' اپنے زمانے میں سیالکوٹ میں بہت مشہور تھی۔ ان پڑھ طبقہ بھی اس تاریخ کو نہایت دلچسپی سے سنتا تھا۔ علامہ اقبال نے ایک خط کے ذریعے غلام قادر فصیح کو تاریخ اسلام لکھنے پر سراہا ہے اور اس تاریخ کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لیے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں کہ اس قسم کے تاریخی رسالے شائع کیے جائیں جس سے ان کو اسلاف کے حالات معلوم ہوں اور ان کے طرز عمل کا ان پر اثر پڑے۔ قوموں کی بیداری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی تاریخ سے

کہاں تک دلچسپی ہے۔آپ کے رسالے کی اشاعت سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان کہاں تک اپنے اسلاف کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

حالات موجودہ کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ایک قسم کی قومی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور تاریخی مضامین کو نہایت توجہ سے سنا جاتا ہے۔اس واسطے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا رحالہ برمحل نکلا ہے اور ہماری ضروریات موجودہ کا کفیل ہوگا۔خود مجھ پر جو اثر اس کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار میں اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کرسکتا کہ بسا اوقات دوران مطالعہ میں چشم پرآب ہوجاتا ہوں اور اس کا اثر میرے دل پر کئی کئی دن تک رہتا ہے۔خدا کرے کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے۔'' (۹۸)

مخزن کے ایڈیٹر سر عبدالقادر نے بھی اس تاریخ اسلام کے بارے میں اپنی رائے پیش کی تھی جس کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

''منشی غلام قادر فصیح نے جو پنجاب کی اخباری دنیا میں مشہور آدمی ہیں تاریخ اسلام کے دلچسپ واقعات مسلسل طور پر شائع کرنے سے ایک نہایت مفید اور قابل قدر کام شروع کیا ہے۔ مستند واقعات احتیاط کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور زبان عام فہم اور سلیس اردو ہے جو ضرور مقبول ہوگی۔ ہر باب بجائے خود مکمل اور دلکش ہے اور ایسا ہے کہ اس سے مبتدی اور منتہی دونوں محظوظ ہوسکتے ہیں۔تاریخ اسلام کے متعلق ایسی عام پسند کتاب شاید اس سے پہلے اردو میں تیار نہیں ہوئی۔'' (۹۹)

مولانا عبداللہ المہادی کی رائے درج ذیل ہے

''تاریخ اسلام کا تازہ نمبر اس وقت ہمارے زیر نظر ہے جو فتح عراق کے واقعات پر مشتمل ہے۔مولف مرحوم نے جس دلآویز و بدیع المثال انداز میں تاریخی حصے پر روشنی ڈالی ہے وہ ان کے مخصوصات میں ہے۔ملک کی سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہی ہے کہ عزت و برتری اور شریفانہ زندگی کے پاک جذبات اور ولولہ انگیز قوم اپنی قومی تاریخ سے ناآشنا نہ رہے۔ ہماری رائے میں تاریخ اسلام کی اشاعت ایک ایسی جلیل القدر اور شاندار اسلامی خدمت ہے جس سے ملک کے مستقبل میں خوشگوار تبدیلی ہوسکتی ہے۔ہم سفارش کرتے ہیں کہ کوئی نسل اس کے مطالعے سے محروم نہ رہے۔واللہ موفق۔'' (۱۰۰)

ڈرامے:

تراجم اور تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ غلام قادر فصیح کی تخلیقات بھی اردو ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ان میں دو ڈرامے بھی شامل ہیں۔ یہ ڈرامے سٹیج ڈراموں کے تقاضوں کے پیش نظر لکھے گئے لیکن ان میں بھی وہ اپنا مقصد نہ بھولے۔دونوں ڈرامے تاریخی ہیں۔''خاتون عثمان'' کے نام سے جو ڈرامہ لکھا اس سلطنت عثمانیہ کے بانی کا ذکر اور فتوحات ہیں۔''سلطان ٹیپو عرف شیر میسو'' نامی ڈرامے میں سلطان ٹیپو کے عزم اور حوصلے کا تذکرہ کیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ یہ ڈرامے مکمل طور پر تاریخی ہیں بلکہ ان میں حسن و عشق کے واقعات بھی موجود ہیں اور اس دور کے ڈرامے کے تقاضوں کے پیش نظر بہت سی غزلیات بھی شامل ہیں۔

یہ ڈرامے فصیح صاحب نے دی بمبئی پارسی اوریجنل اوپیرا کمپنی کے لیے لکھے تھے۔فرداً فرداً ان دونوں ڈراموں کا مختصر جائزہ ذیل میں درج ہے۔

خاتون عثمان

پہلے سین میں شیخ ادیب کا گھر دکھایا گیا ہے۔شیخ ادیب اللہ کا شکر حمد کے ذریعے کرتا ہے۔اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے

بے زبان و بے دہن ہے نطق کلام اللہ کا
سب کلاموں سے بالاتر ہے کلام اللہ کا
ہم بھی اپنے گوشۂ عزلت سے اٹھیں گے ادیب
حشر کے دن ہوگا جب دربار عام اللہ کا (۱۰۱)

شیخ ادیب نماز پڑھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اللہ نے اسے عزت دی کہ وہ مبلغ اسلام بنا۔اس ملک کا بادشاہ بھی مسلمان ہوگیا۔ایشائے کوچک میں صرف ایک قلعہ یونانیوں کے ہاتھ میں ہے۔اے خدا تیرے ہی فضل سے مسلمانوں کو یونانیوں پر فتح ہوئی ہے۔میری کوئی آرزو نہیں

ہے سوائے اس کے کہ اپنی زندگی میں اپنی بیٹی خاتون کا بیاہ کر دوں۔

ایک سبز پوش بزرگ ظاہر ہوتے ہیں اور وہ بشارت دیتے ہیں کہ تمہاری بیٹی ملکہ بنے اور روئے زمین پر حکمرانی کرے گی۔ ادیب بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کی بیٹی خاتون اسے جگاتی ہے۔

دوسرے سین میں شہر کا حاکم شمشیر خان بیٹھا خاتون کی محبت میں آہیں بھر رہا تھا کہ اس کا وزیر آیا اور اس نے تدبیر بتائی کہ حبشی غلام کافور کو بھیج کر خاتون کو پیغام بھجوایا جائے ورنہ اس کو دھمکی سے ڈرایا جائے۔ کافور خود خاتون کا عاشق تھا وہ اس کے پاس گیا اور اسے اپنی طرف سے شادی کا پیغام دیا۔ نہ ماننے کی صورت میں وہ اسے دھمکیاں دے رہا تھا کہ شیخ ادیب گھر آ گیا۔ وہ عصا لے کر حبشی کی خوب درگت بناتا ہے۔ حبشی بھاگ جاتا ہے اور یہ کہتا ہے ''تم نے مجھے مارا ہے مگر دیکھو تم پر کیسی بلا نازل کرتا ہوں۔'' وہاں سے وہ شراب خانے جاتا ہے۔ سب کو شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا کر غافل کر دیتا ہے اور سب نقد و جنس اٹھا کر فرار ہو جاتا ہے۔

شمیشر خان کے دربار میں جا کر وہ اسے خاتون کے انکار کا ماجرا سناتا ہے۔ شمشیر خان طاقت و دولت کے زعم میں سپاہیوں کو ساتھ لے کر خاتون کے گھر جاتا ہے۔ ادیب کے سامنے تجویز رکھتا ہے کہ اپنی بیٹی مجھے دیدے میں تجھے غنی کر دوں گا۔ ادیب بیٹی کے نہ ماننے کا عذر کرتا ہے۔ جھنجھلاہٹ میں شمشیر سپاہیوں کو حکم دیتا ہے کہ انہیں باندھ دو۔ سپاہی آگے بڑھنے لگتے ہیں کہ عثمان تلوار کھینچ کر سامنے آ جاتا ہے۔ عثمان اور شمشیر آپس میں لڑتے ہیں۔ شمشیر خان زخمی ہو کر گر جاتا ہے۔ پھر اس کے دونوں سپاہی عثمان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ عثمان ان کے ساتھ خوب لڑتا ہے۔ لوگ زخمی سپاہیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ادیب اس نوجوان کا شکریہ ادا کرتا ہے اور رات اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ادیب اسے کہتا ہے کہ میں تجھے اس کمرے میں سلاؤں گا جہاں ایک دفعہ فرخ بادشاہ سویا تھا اور خدا کی ہدایت سے مسلمان ہو گیا تھا۔

کافور حاجی کا بھیس بدل کر ادیب کے گھر جاتا ہے۔ خرمے کھلا کر خاتون کو بے ہوش کر کے اسے اٹھا کر جنگل میں لے آتا ہے۔ ادیب کو پتا چلتا ہے تو وہ اس کے تعاقب میں جاتا ہے۔ اس مرحلے پر بھی عثمان ان کی مدد کو آن پہنچتا ہے لیکن اپنا نام پتا نہیں بتاتا۔

ناکام ہو کر کافور یونانی بادشاہ مینول کے پاس جاتا ہے اور اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ

خاتون کو اٹھالائے۔ مینول اور کافور خاتون کو گھر سے پکڑ کے لے جاتے ہیں۔ ادیب گھر آتا ہے تو اسے صورت حال کا علم ہوتا ہے۔ وہ فرخ شاہ کے پاس جاتا ہے۔ فرخ شاہ اپنے بیٹے عثمان کو بلا کر یہ مہم اس کے سپرد کرتا ہے۔ عثمان فوج لے کر مینول کے قلعے پر حملہ کرتا ہے اور اسے شکست دے کر خاتون کو بازیاب کرالیتا ہے۔ خاتون اور عثمان کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ سٹیج کے تقاضوں کے مطابق لکھا گیا ہے۔ سین اس طرح رکھے گئے ہیں کہ دلچسپی کا عنصر قائم رہے۔ اس دور کے سٹیج کے مطابق غزلیات بھی موقعہ محل کے مطابق شامل کی گئی ہیں۔ ڈرامے کی ابتدا ہی اس حمد سے ہوتی ہے جو شیخ ادیب گاتا ہے اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ اسی طرح شمشیر خان اپنی محبت کا اظہار، کافور اپنی ناکامی پر اور خاتون، عثمان کی محبت کا اقرار شاعری کے ذریعے کرتی ہے۔ اس شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں دو تین غزلیات ایسی ہیں جن کے آخر میں تخلص کے طور پر فصیح درج ہے۔ غلام قادر فصیح کے حوالے سے یہ بات مبہم تھی کہ وہ شاعر ہیں یا نہیں۔ ان غزلیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن چند غزلیات یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ شاعر بھی تھے۔ خاتون گھر میں اکیلی تھی اور وہ تنہائی سے گھبرا کر غزل گاتی ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے جس میں فصیح تخلص استعمال کیا گیا ہے۔

گھبرا رہی ہوں اس جگہ تنہائی سے فصیح
مشکل مری تو ٹال دے یارب ذوالجلال (۱۰۲)

دوسری بات یہ کہ جس طرح سٹیج ڈرامے میں ایک کردار ایسا ضرور ہوتا ہے جو ڈرامے کی جان ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں حبشی غلام کافور کا کردار ایسا ہے جس کے مکالمے پڑھ کر اور جس کی شوخیاں دیکھ کر قاری کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ شمشیر خان جب اسے خاتون کے گھر بھیجتا ہے تو وہ راستے میں کہتا ہوا جاتا ہے

''ہمارا حاکم بھی عجیب لغو سراپا خبط ہے کہ اس مہ رو پر مرتا ہے۔ بھلا وہ ایسے زبدۃ الحمقاء کو کب چاہتی ہے۔ یہ کب اس کی سزاوار ہے۔ خدا کی شان۔ حاکم تو بن گئے مگر عقل کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔۔۔۔ خاتون کو تو کوئی مجھ سا بانکا ٹیڑھا ترچھا رنگیلا نکیلا جوان چاہیے جو جوڑ بھی بنے۔ کیوں سچ ہے کہ نہیں۔ دیکھو مستعد بھی ہوں۔ بہادر اور خوبصورت بھی ہوں۔ کماؤ ایسا کہ روٹی سے

کبھی بھوکا نہیں مرا۔ نوکری ملی تو کی، نہیں کسی کے نقب لگائی۔ وہ بھی نہ ہوتو کسی بچے کا مٹھائی کے بہانے زیور اڑایا۔ اس سے بھی رہا تو جیب کتر، پیٹ پالا، کبابی، شرابی، ربابی، فاسق، فاجر، عیار، مکار کوئی کیا مجھ سے بڑھ کر ہوگا۔ پانچوں کیا ساتوں عیب شرعی مجھ میں موجود، استاد نے یہ مصرعہ میرے ہی لیے موزوں کیا ہے ع ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا۔'' (۱۰۳)

وزیر جب اس سے پوچھتا ہے کہ خاتون کے گھر سے کیا خبر لائے ہو تو وہ کہتا ہے

''وہ بھی بڑا احمق ہے جس نے تجھے وزیر بنایا۔ اتنا نہیں سمجھا کہ کافور سے رنگیلے جوان کے ہاتھ پیغام بھیجنا کب مناسب ہے۔ جو عورت کافور کو دیکھ پائے گی وہ کب دوسرے مرد کا نام لے گی۔ اٹھ اس کرسی پر مجھے بیٹھنے دے۔ تو کب اس کے لائق ہے۔'' (۱۰۴)

کافور جب مینول کے پاس جاتا ہے تو وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو تو کافور بڑے مزے سے جواب دیتا ہے

''واہ پنجاب یونیورسٹی کا پاس یافتہ ہوں۔'' (۱۰۵)

خاتون کے کردار میں وہ نزاکت اور ناز موجود ہے جو ایک خاتون سے منسوب ہوتا ہے۔ وہ کافور کی بات کاڈٹ کر جواب دیتی ہے اور اس سے ہرگز گھبراتی نہیں ہے۔

ایک اور خاص بات جو اس ڈرامے میں ہے وہ بہت سی کہاوتوں اور ضرب الامثال کا بیان ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے بہت سی ضرب الامثال استعمال کی گئی ہیں جن سے گفتگو اور مکالموں کے تاثر میں اضافہ ہوا ہے۔ ذیل میں چند محاورات اور ضرب الامثال درج ہیں:

''وہ کنگال لڑکی تمہارا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آئے۔''

''ذات کی چڑیل دماغ پریوں کا''

''سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا''

''یاروں کے پو بارہ ہیں''

''مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔''

''اس نے بھی لہو لگا شہیدوں میں ملنے کی ٹھانی ہے۔''

''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔''

''نیکی برباد گناہ لازم۔''

سٹیج ڈراموں میں کردار چونکہ ناظرین سے مخاطب ہوتے ہیں اور ان کی توجہ کے طالب ہوتے ہیں اس لیے گاہے گاہے اس میں مختلف کردار ناظرین کو بھی مخاطب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جملوں میں قافیوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔شاعری کی صورت میں تو آواز و آہنگ کا خیال رکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جملوں کا آہنگ بھی قابل قدر ہے۔

''دل میں غضب کی طپش ہے۔کسی کے تیر نیم کش کی خلش ہے۔''(۱۰۶)

''پیاری خاتون کاش تو نے اپنا چہرہ نہ دکھایا ہوتا اور اس
دل بے تاب و تواں کو اپنے تیر مژہ کا ہدف نہ
بنایا ہوتا۔''(۱۰۷)

سلطان ٹیپو عرف شیر میسور

اس ڈرامے میں ٹیپو سلطان کے سردار رحیم خان کی بھتیجی امینہ اور قاسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ڈرامے کا آغاز جنگل کے منظر سے کیا گیا ہے جہاں ابراہیم خاں طوفانی بارش اور بجلی کی چمک دمک سے پریشان ہے۔وہ اپنے سردار رحیم خان کی بھتیجی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ حیدر آباد سے سرنگا پٹم جا رہے تھے جہاں ٹیپو سلطان موجود تھا۔امینہ کے باپ کے انتقال کے بعد اس کا چچا اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔راستے میں طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ابراہیم خان پناہ کی تلاش میں آگے بڑھ آیا لیکن اس پر آسمانی بجلی گر پڑی اور وہ مر گیا۔رحیم خان کو اپنی فوج کے اس رسالدار کے مرنے کا بہت غم ہوا تاہم اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔راستے میں ایک برساتی نالہ پار کرتے ہوئے امینہ کی پالکی اس میں گر گئی۔امینہ کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے رحیم خان بھی نالے میں کودا، اسے تو بچا لیا گیا لیکن امینہ کا کچھ پتا نہ چلا۔

امینہ کو اس گاؤں کے بہادر جوان قاسم نے بچایا اور گھر لے آیا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں مل کر اس کو ہوش میں لائے اور اس کے حالات دریافت کیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے لیکن اظہارِ محبت نہ کیا۔ قاسم ایک غریب نوجوان تھا۔ اس نے سوچا:

''دل بھی آیا تو کہاں جہاں نہ امید وصل نہ توقع دیدار۔
ایک وزیرزادی کے ساتھ مجھے کیا سروکار۔ مگر دل ناہنجار مانتا
ہی نہیں۔'' (۱۰۸)

قاسم کے دوست نرسنگداس نے اس کے دل کا حال اس کی حالت سے معلوم کر لیا اور اسے مشورہ دیا کہ یہ نوجوانی کی باتیں ہیں۔ دو چار دن میں بھول جاؤ گے۔ بہرحال دل پر جبر کر کے وہ امینہ کو رحیم خان کے پاس لے گیا جو وہیں ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ امینہ کے مشورے پر رحیم خان نے قاسم کو تجویز دی کہ وہ ٹیپو سلطان کی فوج میں بھرتی ہو جائے۔ قاسم راضی ہو گیا اور ماں کی رضامندی پر وہ ان کے ساتھ سرنگاپٹم روانہ ہوا۔ قاسم کا دوست نرسنگداس بھی اس کی دوستی میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس وقت نرسنگ داس کے جو خیالات بیان کیے گئے ہیں وہ دراصل مصنف کے اپنے نظریات ہیں۔ غلام قادر فصیح ایک وسیع النظر اور غیر متعصب انسان تھے۔ وہ تعصب پر نہیں بلکہ انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔

''لوگ کہتے ہیں ہندو مسلمان کی کیا دوستی۔ کیوں؟
محبت میں مذہب کا کیا دخل ہے۔ الفت میں ذات کا فرق۔
وہ کمینوں کے خیال ہیں۔ ان کے دل تنگ ہیں۔'' (۱۰۹)

ٹیپو سلطان کے دربار میں پہنچ کر رحیم خان کی سفارش پر قاسم کو رسالدار اور نرسنگداس کو جمعدار شاہی رسالہ کے عہدے دیے جاتے ہیں۔ نظام حیدرآباد ٹیپو کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کوئی بیرونی امداد نہ ہونے کے باوجود ٹیپو انگریزوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں رحیم خان امینہ اور قاسم کی شادی کرا دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں میر جعفر کی سازشیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ آخر میں میر جعفر کی غداری سے ٹیپو سلطان مارا جاتا ہے اور انگریز قلعے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ قاسم اور نرسنگداس کو میر جعفر نظر آتا ہے تو اسے پکڑ کر

پھانسی دے دیتے ہیں۔

''خاتون عثمان'' اور ''سلطان ٹیپو عرف شیر میسور'' چونکہ دونوں سٹیج ڈرامے ہیں اس لیے دونوں میں کچھ مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک مماثلت تو یہ ہے کہ دونوں ہیرو خواب دیکھتے ہیں جو وقت آنے پر پورے ہو جاتے ہیں۔ دوسری مماثلت دونوں کے مزاحیہ کردار ہیں۔ خاتون عثمان میں کافور کا کردار اور ''سلطان ٹیپو'' میں مزاحیہ کردار شاہی باورچی زلفو کا ہے جو سنجیدہ ماحول کو زعفران زار بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ذیل میں چند مکالمے درج کیے جاتے ہیں:

''دوزخ یا بہشت میں، ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام''

تم ہی اس کو کاندھے پر اٹھالو میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔''

''بابا سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ باقی سب قصہ کہانیاں ہیں۔''

اس ڈرامے میں بھی مختلف موقعوں پر ضرب الامثال استعمال کی گئی ہیں۔

''کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگا تیلی''

''عشق نہ پوچھے ذات۔''

''جان ہے تو جہان ہے۔''

خفتہ مردہ ایک برابر ہے۔''

''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا''

اس ڈرامے میں داغ اور غالب کی بہت سے غزلیں موقع کی مناسبت سے گائی گئی ہیں۔ پہلی غزل قاسم گاتا ہے جب وہ امینہ کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اپنی کم مائیگی کے احساس سے اقرار نہیں کر پاتا۔ اس کے پہلے دو اشعار درج ذیل ہیں:

تمنایوں تو جیتے جی نہ میرے دل سے نکلے گی

گلے مل کر کسی دن خنجرِ قاتل سے نکلے گی

اگر دشنام وہ دیں گے خبر میں آہ سے لوں گا

وہ ان کے منہ سے نکلے گی یہ میرے دل سے نکلے گی (۱۱۰)

نرسنگداس جب قاسم کی دل جوئی کرتا ہے اور اسے تسلی دیتا ہے کہ وہ امینہ کو چند دنوں میں بھول جائے گا۔ تو اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ دوستی نہیں ہے کہ دوست کو نصیحت کی جائے۔ اس موقع پر وہ غالب کا یہ شعر پڑھتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا (۱۱۱)

انگریزوں سے مقابلہ سے قبل اور مقابلے کے دوران نظمیں اور مناجاتیں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے دو فارسی زبان میں ہیں۔ سلطان ٹیپو کے مارے جانے پر بھی ایک غزل شامل ہے۔

شیر میسور مر مٹا افسوس　　رستم ہند چل بسا افسوس
اے دکن اب تیرا خدا حافظ　　پاسبان اٹھ گیا تیرا افسوس (۱۱۲)

غلام قادر فصیح کا دور انگریزوں کا دورِ حکومت ہے۔ پہلے پہل غلام قادر فصیح کانگریس میں شامل تھے لیکن جلد ہی وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور ایک کامیاب سیاسی رہنما کے طور پر سامنے آئے۔ وہ انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے والے لوگوں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ شیر میسور کے موضوع پر ڈرامہ لکھا تو اس میں بھی انہوں نے انگریز حکومت اور ان کے کردار پر نکتہ چینی کی ہے۔ قاسم کے کردار سے وہ ایک موقع پر یہ کہلواتے ہیں۔

''میں انگریز کافروں سے لڑنے جاتا ہوں۔'' (۱۱۳)

زلفو جب پوچھتا ہے کہ تم انگریزوں کو کافر کیوں کہتے ہو۔ وہ تو اہل کتاب ہیں۔ تو داؤد خان اسے جواب دیتا ہے وہ دراصل مصنف کے خیالات ہیں۔

''انجیل پر پورے طور پر عمل نہیں کرتے اور اپنے عیسیٰ مسیح کو خدا مانتے ہیں۔ اس لیے ہم انہیں کافر کہتے ہیں۔ وہ ہمارے سلطان کے جانی دشمن ہیں اس لیے ہم بھی ان کے جانی دشمن ہیں۔'' (۱۱۴)

سلطان ٹیپو کے انگریز کے بارے میں مکالمے انگریزوں کی حکمت عملی اور سیاسی بصیرت کا مرقع

ہیں۔

''انگریز نہ ہندو کو چاہتے ہیں نہ مسلمان کو۔ وہ اپنی
حکومت چاہتے ہیں اور جو ان کی اس خواہش کے سامنے
رکاوٹ پیدا کرے گا خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان وہ اس کو ہٹائے
بغیر نہیں رہیں گے۔'' (۱۱۵)

غلام قادر فصیح کے یہ دونوں ڈرامے مقصدیت، حسن و عشق، جنگ و جدل، شاعری، سادہ زبان، مزاحیہ کرداروں کے پرلطف جملوں، روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے لیکن موضوع، کردار، مکالموں اور غزلوں کے انتخاب میں یہ ڈرامے آغا حشر کے ڈراموں سے کم نہیں ہیں۔

رسائل اور اخبار:

پنجاب شعراء و ادبا کا مرکز رہا ہے۔ غلام قادر فصیح کا نام تراجم، طبع زاد تصانیف، تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی اور صحافت میں بھی خاصا اہم ہے۔ ان کے جاری کردہ اخبارات و رسائل کی فہرست درج ذیل ہے۔

پنجاب گزٹ:

یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۹۸ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع ہوا جس میں مارل، سوشل اور پولیٹیکل معاملات پر بڑی آزادی اور متانت کے ساتھ بحث ہوتی تھی۔ (۱۱۶)

فصیح صاحب اس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ وہ اپنے قارئین کرام کو اس قسم کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ وہ انگریزوں سے اپنے علاقے آزاد کرانے کی کوشش کریں۔ اخبار پنجاب گزٹ کی سرخیاں عموماً بڑی دلکش ہوتی تھیں۔ نواب محسن الملک سرسید کے دلدادگان میں سے تھے کبھی کبھی اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جایا کرتے تھے۔ جن دنوں نواب محسن الملک نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا تو فصیح صاحب نے اس استعفیٰ پر یہ سرخی جمائی:

''نواب محسن الملک کا موسمی استعفیٰ''

فصیح صاحب کے ہفتہ وار گزٹ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے رشید نیاز نے ''تاریخ سیالکوٹ'' میں لکھا ہے:

''یہ موقر ہفتہ وار رسالہ پنجاب کی مشہور انقلابی شخصیت جناب منشی غلام قادر فصیح کی ادارت میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ نصب العین تحریک آزادی کو کامیاب بنانا تھا۔'' (۱۱۷)

تاریخ صحافت اردو کی تیسری جلد میں امداد صابری نے ''پنجاب گزٹ'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''سیالکوٹ سے یہ ہفتہ وار پرچہ ۱۸۹۸ء میں نکلا۔ یک شنبہ کو آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹر منشی غلام قادر فصیح تھے۔ سالانہ چندہ دو روپیہ تھا۔ پنجاب پریس میں چھپتا تھا۔'' (۱۱۸)

ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے ''پنجاب میں اردو صحافت'' میں پنجاب گزٹ کا ذکر کیا ہے۔

''۱۸۹۸ء میں منشی غلام قادر فصیح نے پنجاب گزٹ جاری کیا۔ یہ تحریک آزادی کا حامی تھا۔'' (۱۱۹)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی کتاب ''کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات و رسائل'' میں امداد صابری کی تیسری جلد کا حوالہ دے کر پنجاب گزٹ کا ذکر کیا ہے۔

''پنجاب گزٹ''، سیالکوٹ، ہفتہ وار
اجرا: ۱۸۹۸، ایڈیٹر منشی غلام قادر
پرنٹر: پنجاب پریس سیالکوٹ (صابری ۳) (۱۲۰)

رسالہ ناولسٹ

یہ ماہوار رسالہ سیالکوٹ سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہوتے تھے۔ (۱۲۱)

اس رسالے میں فصیح صاحب نے سب سے پہلے ''دی مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن'' کا ترجمہ شائع کیا۔ فصیح صاحب اس رسالے میں انگریزی ناولوں کا اردو ترجمہ کر کے شائع کرتے تھے۔ بعدازاں ان ترجموں کو کتابی صورت میں شائع کر دیتے تھے۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اس رسالہ کا تذکرہ امداد صابری کی پانچویں جلد کے حوالے سے یوں کیا ہے:

''ناولسٹ، لاہور، ماہنامہ

اجرا: نومبر ۱۹۱۱ء، ایڈیٹر: غلام قادر فصیح

ایک شعری گلدستہ (صابری ۵) (۱۲۲)

رسالہ الحق

یہ ماہوار رسالہ پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ (۱۲۳)

پنجاب جرنل

فصیح صاحب نے ایک ماہوار رسالہ ''پنجاب جرنل'' اپنے ہی پریس سے شائع کیا لیکن کچھ عرصے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ (۱۲۴)

امداد صابری نے ''تاریخ صحافت اردو'' کی چوتھی جلد میں پنجاب جرنل کا ذکر بھی کیا ہے۔

''سیالکوٹ سے مارچ ۱۹۰۷ء کو یہ ماہانہ رسالہ وجود میں

آیا۔ چار جزو پر نکلتا ہے۔ مہتمم و ایڈیٹر غلام قادر فصیح تھے۔
سالانہ چندہ دو روپے تھا۔ اس رسالہ کی پالیسی ہندو مسلمان
اور دیگر اقوام ہند میں اتحاد و اتفاق بڑھانا تھا۔'' (۱۲۵)

ابو سلمان شاہ جہانپوری نے یہ حوالہ یوں درج کیا ہے:

''پنجاب جرنل''، سیالکوٹ، ماہنامہ
اجرا: مارچ ۱۹۰۷ء، ایڈیٹر: غلام قادر فصیح
فرقہ وارانہ اتحاد کا حامی (صابری ۴) (۱۲۶)

غلام قادر فصیح ہمہ جہت اور جامع الحیثیات تھے۔ وہ بیک وقت مترجم، مؤلف، مصنف، سیاسی رہنما، صحافی، پریس کے مالک اور مؤرخ اسلام تھے۔ انہوں نے ہر ایک میدان میں اپنی انفرادیت کو منوایا۔ اگرچہ وہ مترجم اور صحافت کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئے تاہم ان کے دیگر کام بھی نمایاں اہمیت رکھتے ہیں جن کا تذکرہ اس باب میں کیا جا چکا ہے۔

باب دوم — حوالہ جات

۱۔ پنجاب گزٹ، ۱۸۹۵ء، ص ۹۶
۲۔ غلام قادر فصیح، برگنڈی کی شہزادی، پنجاب پریس سیالکوٹ، ۱۸۹۴ء، ص ۱، ۲
۳۔ ایضاً، ص ۸
۴۔ ایضاً، ص ۹

۵۔ایضاً،ص ۲۵

۶۔ایضاً،ص ۴۷

۷۔ایضاً،ص ۱۲۰

۸۔ایضاً،ص ۱۴۴

۹۔ایضاً،ص ۱۴۴

۱۰۔خواجہ عبدالوحید مرحوم (مرتب) مقدمہ وحواشی ڈاکٹر گوہر نوشاہی، جائزہ زبان اردو (پنجاب)، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۷۰

۱۱۔غلام قادر فصیح، بشابر کھشا یعنی زہریلا درخت، پنجاب پریس سیالکوٹ، ۱۸۹۴ء، ص ۱۷

۱۲۔ایضاً،ص ۶۳

۱۳۔غلام قادر فصیح، ہیبت ناک کارلس، پنجاب پریس سیالکوٹ، ۱۸۹۷ء، ص ۴۵

۱۴۔ایضاً،ص ۱۳۶

۱۵۔منشی غلام قادر فصیح، تحقیقی مقالہ ایم۔اے اردو، مقالہ نگار محمد صادق، نگران ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۲ء، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۱۷

۱۶۔ دربار لندن کے اسرار، تیسرا سلسلہ پہلی جلد، ۱۸۹۷ء، پنجاب پریس لاہور، ص ۱۱

۱۷۔ایضاً،ص ۲۳

۱۸۔منشی غلام قادر فصیح، مقالہ ایم۔اے اردو، ص ۲۰

۱۹۔پنجاب گزٹ ۱۸۹۸ء، ص ۳۸۴

۲۰۔پنجاب گزٹ ۱۸۹۹ء، ص ۱۴۰

۲۱۔پنجاب گزٹ، ۱۸۹۹ء، ص ۲۲۹

۲۲۔مقالہ ایم۔اے اردو، ص ۲۰

۲۳۔ایضاً،ص ۲۱

۲۴۔ایضاً،ص ۲۱

۲۵۔پنجاب گزٹ ۱۸۹۳ء، ص ۱۰۴، ۱۰۵

۲۶۔پنجاب گزٹ ۱۸۹۵ء، ص ۲۷۴

۲۷۔غلام قادر فصیح ،عمر پاشا،پہلی جلد، پنجاب پریس لاہور،۱۸۹۳ء،ص ا

۲۸۔ایضاً،ص ۱۸

۲۹۔ایضاً،ص ۲۵

۳۰۔عمر پاشا،دوسری جلد،ص ۱۹۸

۳۱۔ایضاً،ص ۲۰۰

۳۲۔فسانہ عجیب الخلقت یا گلیور صاحب کی سیاحت ،سبحانی پریس لاہور، ۱۸۹۵ء، سرورق کی عبارت

۳۳۔ایضاً،ص ۴

۳۴۔ایضاً،ص ۱۳

۳۵۔ایضاً،ص ۲۴

۳۶۔ایضاً،ص ۲۵

۳۷۔ایضاً،ص ۳۵

۳۸۔ایضاً،ص ۳۶

۳۹۔ایضاً،ص ۶۲

۴۰۔ایضاً،ص ۸۳

۴۱۔منشی غلام قادر فصیح ،مقالہ ایم۔اے اردو،ص ۲۲

۴۲۔ایضاً،ص ۲۲

۴۳۔ایضاً،ص ۲۳

۴۴۔ایضاً،ص ۲۳

۴۵۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۹ء،ص ۵۷

۴۶۔غلام قادر فصیح ،وطن پر قربانی یعنی ہالینڈ کی آزادی،قومی پریس سیالکوٹ، ۱۹۰۸ء،ص ۳،۴

۴۷۔ایضاً،ص ۱۰

۴۸۔ایضاً،ص ۵۲،۵۳

۴۹۔ایضاً،ص ۹۶

۵۰۔ایضاً،ص۱۱۲

۵۱۔پنجاب گزٹ ۱۹۱۳ء،ص۱۲۵

۵۲۔غلام قادر فصیح،محب وطن سفری بی بی،روز بازار سٹیم پریس امرتسر،۱۹۱۲ء،ص۸۸

۵۳۔ایضاً،ص۲۷،۲۸

۵۴۔ایضاً،ص۲۹

۵۵۔غلام قادر فصیح،ظالمانہ حکومت کا خاتمہ یعنی زاریت کا زوال،قومی پریس سیالکوٹ،۱۹۰۸ء،
ص۲،۱

۵۶۔ایضاً،ص۵

۵۷۔ایضاً،ص۴۲

۵۸۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۹ء،ص۱۳۲

۵۹۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۹ء،ص۶۰

۶۰۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۸ء،ص۲۹۹

۶۱۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۷ء،ص۱۴۳

۶۲۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۷ء،ص۲۵۲

۶۳۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۸ء،ص۳۴۲

۶۴۔پنجاب گزٹ ۱۹۱۳ء،ص۱۲۴

۶۵۔پنجاب گزٹ ۱۸۹۴ء،ص۳۲۵

۶۶۔پنجاب گزٹ ۱۹۰۴ء،ص۳۳۶

۶۷۔غلام قادر فصیح،تاریخ اسلام۔عرب کا جغرافیہ،روز بازار سٹیم پریس امرتسر،۱۹۱۴ء،دیباچہ

۶۸۔ایضاً،دیباچہ

۶۹۔ایضاً،دیباچہ

۷۰۔ایضاً،دیباچہ

۷۱۔تاریخ اسلام۔عرب کا جغرافیہ،ص۱

۷۲۔ایضاً،ص۲،۱

۷۳۔ایضاً،ص ۳۳

۷۴۔ایضاً،ص ۴۰

۷۵۔ایضاً،ص ۴۰،۴۱

۷۶۔ایضاً،ص ۴۱

۷۷۔غلام قادر فصیح ،بابانانک صاحب،ظفر المطابع سیالکوٹ،۱۸۸۹ء،ص ۲

۷۸۔ایضاً،ص ۴

۷۹۔ایضاً،ص ۱۰

۸۰۔ایضاً،ص ۱۲

۸۱۔ایضاً،ص ۱۶

۸۲۔غلام قادر فصیح ،سری رام کرشن پرمہنس اور ہندوستان کی بیداری، ہندوستان سٹیم پریس لاہور، ۱۹۰۹ء،ص ۶

۸۳۔ایضاً،ص ۱۲

۸۴۔ایضاً،ص ۱۳

۸۵۔ایضاً،ص ۱۴

۸۶۔ایضاً،ص ۱۸

۸۷۔ایضاً،ص ۳۱

۸۸۔ایضاً،ص ۳۳

۸۹۔ایضاً،ص ۵۰

۹۰۔ایضاً،ص ۶۱، ۶۲

۹۱۔ایضاً، ۹۶

۹۲۔ایضاً،ص ۹۷

۹۳۔ایضاً،ص ۱۱۸

۹۴۔منشی غلام قادر فصیح ،مقالہ ایم۔اے اردو،ص ۲۵

۹۵۔تاریخ اسلام،تمہیدی نوٹ

۹۶۔تاریخ اسلام، جلد سوم، شیخ مبارک علی لوہاری دروازہ لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۶۳۷، ۶۳۸

۹۷۔ایضاً، ص ۷۰۳، ۷۰۴

۹۸۔شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ حصہ دوم، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۶۳، ۲۶۴

۹۹۔شیخ عبدالقادر، ایڈیٹر مخزن، یہ رائے تاریخ اسلام کی ہر جلد کے آخر میں دی گئی ہے۔

۱۰۰۔مولانا عبداللہ المہادی، تاریخ اسلام کی ہر جلد کے آخر میں دی گئی رائے

۱۰۱۔خاتون عثمان، ص ا

۱۰۲۔ایضاً، ص ۹

۱۰۳۔ایضاً، ص ۷، ۸

۱۰۴۔ایضاً، ص ۱۵

۱۰۵۔ایضاً، ص ۲۵

۱۰۶۔ایضاً، ص ۵

۱۰۷۔ایضاً، ص ۵

۱۰۸۔غلام قادر فصیح، سلطان ٹیپو عرف شیر میسور، مفید عام پریس سیالکوٹ، ۱۹۰۸ء، ص ۱۵، ۱۶

۱۰۹۔ایضاً، ص ۲، ۳

۱۱۰۔ایضاً، ص ۱۵

۱۱۱۔ایضاً، ص ۲۴

۱۱۲۔ایضاً، ص ۹۷

۱۱۳۔ایضاً، ص ۳۸

۱۱۴۔ایضاً، ص ۳۹

۱۱۵۔ایضاً، ص ۷۶

۱۱۶۔مقالہ ایم۔اے اردو، ص ۲۸

۱۱۷۔رشید نیاز، تاریخ سیالکوٹ، مکتبہ نیاز سیالکوٹ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۶۲

۱۱۸۔امداد صابری، تاریخ صحافت اردو (جلد سوم)، جدید پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۵۶۱

۱۱۹۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی، پنجاب میں اردو صحافت، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۶

۱۲۰۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات اور رسائل ۱۹۴۷ء تک، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۷۶

۱۲۱۔مقالہ ایم۔اے اردو، ص ۲۸

۱۲۲۔ابوسلمان شاہ جہانپوری، ص ۲۱۴

۱۲۳۔مقالہ ایم۔اے اردو، ص ۲۸

۱۲۴۔ایضاً، ص ۲۹

۱۲۵۔امداد صابری، تاریخ صحافت اردو (جلد چہارم)، ص ۶۴۱

۱۲۶۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری، کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات اور رسائل ۱۹۴۷ء تک، ص ۴۷

باب سوم

موتیوں کا جزیرہ۔ تجزیاتی مطالعہ

ترجمے کی ضرورت واہمیت:

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی۔ انگریزی میں اس کے لیے Translation کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ترجمے کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ زمانۂ قدیم میں جب انسان اشاروں کنایوں میں اپنی بات سمجھاتا تھا تو سمجھنے والا ان اشاروں اور علامتوں کی مدد سے مفہوم اخذ کرتا تھا۔ پھر جیسے جیسے زبانوں اور علامتوں نے فروغ پایا تو وہ صرف چند بولنے والوں کی ترجمانی نہیں تھی بلکہ وہ الفاظ ان کی تہذیب، معاشرت، رہن سہن اور افکار کے عکاس ہوتے تھے۔ وہی بات دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والے سمجھ تو لیتے ہیں لیکن ہو بہو وہ الفاظ و مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔

انسانی تعلقات، کاروباری لین دین، جذبات واحساسات یا تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے سب سے بنیادی چیز ابلاغ ہے جس کا سب سے اہم ذریعہ الفاظ ہیں۔ انسان کسی بھی معاشرے، مذہب، پیشے یا زبان سے تعلق رکھتا ہو انسانی احساسات ان میں مشترک ہوتے ہیں یعنی بنیادی فرق الفاظ کا ہوتا ہے اور الفاظ بذات خود کچھ نہیں ہوتے ان کے پس منظر میں ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک تاریخ ہوتی ہے۔ تہذیب، تاریخ، محبت، نفرت، خوشی اور غم یہ سبھی الفاظ اپنے اندر گہرا مفہوم لیے ہوئے ہیں۔ جب ہم یہ الفاظ ادا کرتے ہیں تو ان کے مطالب بھی ہمارے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔

ترجمہ انسانی تہذیب کا مسلسل عمل ہے جو ہر وقت جاری رہتا ہے۔ تہذیب، معاشرہ، کلچر، تجارت، سیاست، ڈپلومیسی مسلسل تراجم کا تقاضا کرتے ہیں۔ جب ہم تجارتی لین دین اور خرید وفروخت کرتے ہیں تو یہ دراصل ترجمہ ہی کی ایک شکل ہے۔ ترجمہ انسانی تہذیب کی بنیادی ضرورت ہے۔

''ترجمے کے ذریعے زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی
ہیں اور کسی بڑی اور وسیع زبان کو اپنے قالب میں سمو کر وہ
یقین اور خود اعتمادی پا لیتی ہیں جو ترجمے کی مشق اور کوشش،
تربیت اور کامیابی کا واضح نتیجہ ہیں۔''(۱)

ترجمہ سے انسانی علم میں اضافہ ہوتا ہے اور زبان کی ساخت اور اسالیب کو نئے نئے میدان مل جاتے ہیں۔ نئے علوم اور نئی اصناف سے واقفیت ہوتی ہے۔ رومانوی اسلوب و تحریک ہو یا ترقی پسند، جدیدیت و مابعد جدیدیت کا مسئلہ ہو یا وجودی فلسفے کا بیان، ساختیات کے اصول و رموز ہوں یا پس ساختیات، یہ سب فلسفے اور اسالیب ہم تک انگریزی ادب کے مطالعے اور ترجمے کے ذریعے پہنچے ہیں۔

''یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون
میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں
کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور زندہ اقوام
کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے علمی
خزانوں کو معمور کرتی ہے۔''(۲)

یہ بات ایک حد تک تو درست ہے کہ نئی زبانیں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے تراجم کی مدد سے اپنے علمی سرمائے میں اضافہ کر لیتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف زبان کے ابتدائی دور میں ہی نہیں بلکہ اپنے استحکام اور ترقی کے دور میں بھی ترجمے کا عمل زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔

ترجمے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس سے نئے نئے خیالات اور موضوعات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور اسالیب و اظہار کے نئے راستے زبان میں راہ پاتے ہیں۔ ترجمہ دو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے متعارف کراتا ہے، ان کو آپس میں جوڑتا اور ملاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''کہا جا سکتا ہے کہ ترجمے کے عمل کے بغیر انسانی
تہذیب اور علوم و فنون کی ترقی ممکن نہ تھی اور ترجمہ نے اس
میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔''(۳)

کسی زبان کو آگے بڑھانے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے میں تراجم کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کلاسیکی اردو نثر داستانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے زیادہ تر داستانیں ترجمہ یا اخذ شدہ ہیں۔ باغ و بہار، داستان امیر حمزہ، آرائش محفل، مذہب عشق ترجمے یا اخذ کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس وقت ترجمے کی جو ابتدائی صورت حال ہمیں نظر آتی ہے وہ یوں ہے کہ مترجمین نے بہت سی تبدیلیاں متن میں از خود کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن کے اسلوب کی وجہ سے باغ و بہار کو تصنیف و تخلیق کہا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تخلیق نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ باغ و بہار کا موضوع اور قصہ میر امن کا نہیں تھا لیکن میر امن نے اس کو اپنے اسلوب اور مقامی معاشرت میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ دلی کی تہذیب و معاشرت کا عکاس بن گیا ہے۔ فارس کی تہذیب کو بدل کر دلی کی تہذیب کا بیان مترجم کی کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے۔ اس کے باوجود چونکہ باغ و بہار ابتدائی کاوش تھی اس لیے ترجمے کی روایت میں اسے اولیت کا درجہ ملا جس نے آگے چل کر ترجمے کے اصول متعین کرنے میں مدد دی۔

اردو میں نثری تراجم کا آغاز سترھویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ عام طور پر سترھویں صدی میں ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) کو سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جاتا ہے مگر تحقیقی اعتبار سے شاہ میراں جی خدانما (دکن) سب سے پہلے مترجم قرار پائے ہیں جن کا تعلق قطب شاہی عہد سے تھا۔ (۴)

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ مترجمین میں میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، مرزا کاظم علی جوان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ دلی کالج کی ترجمہ کی کاوشیں، ۱۸۶۲ء میں سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی، ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے تحت انگریزی شعراء کے منظوم تراجم، دارالمصنفین (۱۹۱۳ء) کا قیام، جامعہ عثمانیہ (۱۹۱۷ء) میں دارالترجمہ کا قیام تراجم کی ایک ایسی روایت اور کڑی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے طور پر ترجموں کے اصول و قوانین مرتب کیے اور ان کے زیر اثر بہت سے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی تصانیف کے تراجم کیے گئے۔

بیسیوں صدی کے آغاز سے غیر ملکی افسانوی ادب کے اردو تراجم کو فروغ ملا۔ ان

مترجمین میں سجاد حیدر یلدرم، خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری، ل۔احمد محمد مجیب، منصور علی، فضل حق قریشی اور اختر حسین رائے پوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں غلام قادر فصیح نے فرانسیسی ناول "The Counte of Monte Cristo" کا اردو میں ترجمہ ''موتیوں کا جزیرہ'' کے نام سے کیا۔ الیگزینڈر ڈوما کے اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ غلام قادر فصیح نے انگریزی ترجمے کو سامنے رکھا اور اس کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس دور میں یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور آج بھی ''موتیوں کا جزیرہ'' ترجمے کی تاریخ میں اہم مقام کا حامل ہے۔ اس ناول میں نپولین بوناپارٹ کے عہد کو پیش کیا گیا ہے۔ فرانس کی تاریخ میں لوئیس شانزدہم اور نپولین بوناپارٹ کا عہد حکومت ایک ایسا سیاسی دور ہے جس نے وہاں کی رعایا کو بہت متاثر کیا۔ وہ لوگ جو نپولین کے طرفدار تھے انہیں لوئیس شانزدہم کے عہد حکومت میں قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ الیگزینڈر ڈوما نے اپنے تاریخی ناول میں اسی حکومت و سیاست کو بنیاد بنایا اور چھ جلدوں میں Le Comte de Monte Cristo کے نام سے ناول لکھا۔ اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ ترجمے کا یہ سلسلہ صرف انگریزی تک محدود نہیں رہا بلکہ غلام قادر فصیح نے اس ناول کا اردو میں ترجمہ کیا۔

ناول کے کردار:

ایڈمنڈ ڈینٹز:	ناول کا مرکزی کردار، اس کے ذریعے فرانس کی سیاست اور تہذیب و معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔
مرسیڈیز:	ایڈمنڈ کی محبوبہ
ایم۔مارل	جہاز کا مالک جہاں ایڈمنڈ کام کرتا تھا۔
فرنڈ	مرسیڈیز کا چچازاد بھائی جو اس سے محبت کرتا تھا اور شادی کا خواہش مند تھا
ڈینگلرس	جہاز کا منتظم جو ایڈمنڈ کے ماتحت کام کرتا تھا اور اس سے حسد کی وجہ سے مشکلات میں پھنسانے کی کوششوں میں مصروف

رہتا تھا۔ اپنی سازش کی بدولت اس نے ایڈمنڈ کو نپولین کا طرفدار ثابت کیا اور اسے قید کروادیا۔

کیڈروس — ایڈمنڈ ڈینٹز کا ہمسایہ۔ لالچی صفت انسان

ایم۔ ڈی ولفورٹ — فرانس کی سیاست کا اہم مہرہ۔ شہنشاہ کا حامی جو ایڈمنڈ کو سازش میں پھنساتا ہے اور اسے نپولین کا طرفدار ثابت کر کے قلعہ ڈی ایف بھجوادیتا ہے جہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔

ابی فیریا — قلعہ ڈی ایف میں قید بوڑھا جس نے ایڈمنڈ کو مانٹی کرسٹو کے خزانے کا راز بتایا۔

ناول کی کہانی:

فروری ۱۸۱۰ء کو مارسیلز کی بندرگاہ پر ایک جہاز کی آمد ہوئی جس کا نام ''فرعون'' تھا۔ یہ جہاز تین ماہ بعد اپنے تجارتی سفر سے واپس آیا تھا۔ ایڈمنڈ ڈینٹز، جہاز کے مالک ایم۔ مارل سے ملا اور اسے جہاز کے کپتان کی اچانک موت کے بارے میں بتایا کہ دورانِ سفر اس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اور وہ مرنے کے قریب ہوگیا تھا۔ اس حالت میں اس نے ایڈمنڈ کو اپنے پاس بلایا اور جہاز کے انتظام کی ذمہ داری سونپ کر ایک آخری خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک خط البا کے جزیرے پر گرینڈ مارشل تک پہنچادے۔ اس سے اگلے دن کپتان مرگیا۔ کپتان کی آخری خواہش کے مطابق ایڈمنڈ البا اترا اور گرینڈ مارشل سے ملاقات کی۔ جس نے اسے پیرس میں پہنچانے کے لیے ایک خط دیا۔ ایم۔ مارل کپتان کی موت کی خبر سن کر افسردہ ہوا اور اس نے ایڈمنڈ کو فرعون کا کپتان بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر ڈینگلرس کو سخت حسد ہوا۔ وہ بھی اسی جہاز میں ایڈمنڈ کے ساتھ منتظم تھا اور اس کی ہر دلعزیزی سے جلتا تھا۔ اس نے ایم۔ مارل کو ایڈمنڈ سے متنفر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایڈمنڈ وہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا، اپنے باپ ڈینٹز سے ملا اور اسے سخت بدحال پایا۔ وہ حیران ہوا کیونکہ وہ جاتے ہوئے اسے معقول رقم خرچ کے لیے دے گیا تھا۔

ڈینٹز نے بیٹے کے اصرار پر بتایا کہ تم نے اپنے ہمسائے کیڈروس سے جو رقم بطور قرض لی تھی وہ تمہارے جانے کے بعد اپنی رقم کا تقاضا کرنے آیا تھا۔ جس پر میں نے اسے اس کی مطلوبہ رقم ادا کر دی۔ ایڈمنڈ سخت کبیدہ خاطر ہوا۔ اسی اثنا میں کیڈروس اس سے ملنے آیا اور ڈینٹز نہ صرف اس سے خوش دلی سے ملا بلکہ اسے کچھ رقم ادھار دینے کے دعوت بھی دی۔ اپنے باپ سے ملنے کے بعد وہ مرسیڈیز سے ملنے گیا جس سے وہ محبت کرتا تھا اور شادی کا خواہاں تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے مرسیڈیز اور فرننڈ کو محوِ گفتگو پایا۔ فرننڈ بھی مرسیڈیز سے محبت کرتا تھا اور اس وقت بھی وہ اسے شادی کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ مرسیڈیز نے انکار کرتے ہوئے ایڈمنڈ کی محبت کا اقرار کیا جس پر فرننڈ کو سخت حسد ہوا۔ مرسڈیز کے کہنے پر بادل ناخواستہ اس نے ایڈمنڈ سے ہاتھ ملایا اور غم و غصے سے باہر نکل گیا۔ جہاں قریبی شراب خانے میں ڈینگلرس اور کیڈروس نے اسے آواز دے کر بلایا اور وہاں انہوں نے ایڈمنڈ کے خلاف ایک منصوبہ بنایا جس میں ایڈمنڈ کو نپولین کا طرفدار ثابت کیا گیا تھا۔ ڈینگلرس نے شکستہ تحریر میں ایک خط حاکم اعلیٰ کو لکھا جس میں ایڈمنڈ کے البا جانے اور نپولین سے ملاقات کو واضح طور پر لکھا۔ کیڈروس شراب کے نشے میں دھت ہونے کے باعث ان کے اس منصوبے میں شریک نہ تھا تاہم جہاں کہیں اس کے کانوں میں کچھ الفاظ پڑے تو اس نے احتجاج کیا لیکن ڈینگلرس اور فرننڈ نے اسے مزید شراب پینے کے لیے پیسے دے دیے۔ فرننڈ نے وہ خط اٹھایا اور قریبی ڈاک خانے کی طرف دوڑا۔

دو دن بعد ایڈمنڈ کی شادی کا دن مقرر تھا جس میں ضیافت کے موقع پر شادی کی رسومات سے قبل اسے گرفتار کر لیا گیا ایم ڈی ولفورٹ کی عدالت میں اسے پہنچا دیا گیا جہاں دورانِ تفتیش ولفورٹ کو پتہ چلا کہ نپولین نے جو خط البا سے پیرس پہنچانے کے لیے دیا ہے وہ نورٹیئر کے نام ہے جو کہ ولفورٹ کا باپ تھا ایم نورٹیئر نپولین کا حامی تھا جبکہ ولفورٹ بادشاہ کا وفادار تھا ولفورٹ نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ خط اسے اور اس کے باپ کو پھنسا نہ دے اس نے ایڈمنڈ کے سامنے خط جلا دیا اور اسے تحفظ کی ضمانت دی لیکن در پردہ اس نے سپاہیوں کے ذریعے ایڈمنڈ کو قلعہ ڈی ایف میں بھجوا دیا جہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ایڈمنڈ بہت چیخا چلایا اور احتجاج کیا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی اور اسے دیوانہ اور جنونی قرار دے کر زمین دوز قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس کے عزیز و اقارب اس کی حالت سے بے خبر تھے۔ جہاز کے مالک ایم۔ مارل نے

ولفورٹ کے پاس جا کر ایڈمنڈ کی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مرسڈیز نے بھی ولفورٹ کو ایڈمنڈ کی سادہ دلی اور شفاف زندگی کے بارے میں بتایا لیکن بے سود۔ ولفورٹ نے ایڈمنڈ کے معاملات سے اور جائے قید سے لاعلمی کا اظہار کیا اور یوں ایڈمنڈ قید ہی رہا۔

قید کے دوران میں ایک روز ایڈمنڈ کو اپنی کوٹھڑی کی دیوار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی دیوار کو کھرچ رہا ہو۔ اس نے پوچھا کون ہے تو آوازیں بند ہو گئیں۔ ایڈمنڈ نے ہمت کی اور کھانے والے برتن سے لوہے کے ہینڈل کو الگ کر کے خود دیوار میں شگاف کرنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں اسے علم ہوا کہ وہ دیوار ایک اور قیدی ابی فیریا کی کوٹھڑی سے ملحق ہے۔ شگاف کے ذریعے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ ابی فیریا اٹلی کا عالم فاضل ۵۰ سالہ کمزور جسامت شخص تھا۔ وہ فرار ہونے کے لیے دیوار میں شگاف کر رہا تھا لیکن اندازے کی ذرا سی غلطی سے وہ دیوار ایڈمنڈ کی کوٹھڑی کی نکلی۔ ایڈمنڈ نے فیریا کو اپنا روحانی باپ اور استاد و رہنما مان لیا اور اس سے بہت سے علوم سیکھے۔ ایڈمنڈ کے حالات سن کر ابی فیریا نے اپنی ذہانت اور قیافہ شناسی سے بتایا کہ کس طرح ڈینگلرس، کیڈروس، فرنینڈ اور ولفورٹ نے اپنے اپنے فائدے کے لیے اس کو استعمال کیا ہے۔ اور اسے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔ ایڈمنڈ نے وہیں قید خانے میں اُن چاروں سے انتقام لینے کا عہد کیا۔

نپولین کے عہدِ حکومت میں ایم۔ مارل دوبارہ ولفورٹ کے پاس گیا۔ اسے امید تھی کہ اب تو اس کی شنوائی ضرور ہو گی لیکن ولفورٹ کی رعونت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے کہنے پر مارل نے ایک خط لکھا جس میں ایڈمنڈ کی نپولین سے وفاداریاں ظاہر کی گئی تھیں اور اس کی رہائی کی سفارش کی۔ ولفورٹ نے یہ خط بھجوانے کا وعدہ کیا لیکن اس کو پورا نہ کیا۔ نپولین کے عہدِ حکومت میں ڈینگلرس بہت خوفزدہ ہوا کہ اب ایڈمنڈ اس سے بدلہ لینے آن پہنچے گا۔ اس نے ایم۔ مارل سے کہا کہ میں سمندر کی ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ مارل کی سفارش سے وہ ہسپانیہ کے ایک سوداگر کے پاس نوکر ہو گیا۔ پھر وہ میڈرڈ کی طرف چلا گیا جہاں سے اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ کیڈروس بھی فرنینڈ کی طرح فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ایڈمنڈ کا باپ بیٹے کی قید کے پانچ مہینے کے بعد مر گیا۔ ایم۔ مارل نے نہ صرف اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا بلکہ اس کے ذمے جو قرض تھے وہ بھی ادا کر دیے۔

ایڈمنڈ اور ابی فیریا قید سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اس پر عمل کر رہے تھے کہ اسی دوران فیریا کو سخت دورہ پڑا۔ ایڈمنڈ نے اس کی تیمارداری کی اور فرار ہونے کے مواقع ہونے کے باوجود وہ فیریا کے ساتھ ہی رہا۔ اس کی تیمارداری، محبت اور وفاداری سے متاثر ہو کر فیریا نے اسے مانٹی کرسٹو کے جزیرے میں موجود دولت کے بارے میں بتایا کہ اگر کبھی فرار ہونے کا موقع ملا تو وہ اس خزانے کو حاصل کر لیں گے ورنہ وہ اکیلا ہی اس خزانے کو پالے۔ ایڈمنڈ نے اس بات کی طرف زیادہ توجہ نہ کی کیونکہ اسے فیریا کی صحت کی زیادہ فکر تھی اور وہ اس کی ذہنی صحت پر کوئی شک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فیریا کو دوسرا شدید دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ مرتے ہوئے بھی اس نے ایڈمنڈ کو ہدایت کی کہ وہ مانٹی کرسٹو کے جواہرات اور دولت کو ضرور یاد رکھے۔ مایوسی اور تنہائی کے اس عالم میں ایڈمنڈ کے دماغ میں فرار ہونے کا خیال روشن ہوا۔ ڈاکٹروں نے فیریا کی موت کی تصدیق کر دی تھی اور اسے کمبل اوڑھا کر رات کو اس کی تدفین کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ ایڈمنڈ نے فیریا کو اپنی کوٹھڑی میں اپنی چادر اوڑھا کر لٹا دیا اور خود اس شگاف کے ذریعے فیریا کی کوٹھری میں آ گیا جو دونوں کے میل ملاپ کا ذریعہ تھا۔ رات کو دس گیارہ بجے کے قریب محافظ آئے اور ایڈمنڈ کو فیریا کے دھوکے میں اٹھا لے گئے اور اس کے پاؤں کے ساتھ بھاری وزن باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا۔ مرنے کے بعد قیدیوں کو ٹھکانے لگانے کا وہاں یہی بندوبست تھا۔ ایڈمنڈ نے فیریا کے بنائے ہوئے چاقو سے اس وزن والی رسی کو کاٹ دیا۔ وہ چاقو اس نے اپنی حفاظت کے لیے ہاتھ ہی میں پکڑ رکھا تھا تاکہ کسی مرحلے پر اسے اپنی حفاظت کے لیے استعمال کر سکے۔ چونکہ وہ ملاح تھا اس لیے وہ تیرتا ہوا قریبی جزیرے پر پہنچ گیا جہاں سے سمگلروں کے ایک جہاز نے اسے بچایا۔ ایڈمنڈ نے جہاز تباہ ہونے کی فرضی کہانی سنا کر انہیں مطمئن کر دیا اور اپنی کپتانی کی صلاحیت اور تجربہ کاری کی بنا پر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تین ماہ کے معاہدے کے بعد اس نے نہ صرف اپنے حلیے کو سنوار لیا بلکہ ایک معقول رقم بھی کما لی۔ ۱۴ سال قید میں رہنے سے اس کی وضع قطع میں بہت فرق پڑ گیا تھا اور کوئی اپنا بھی اس کو نہ پہچان سکتا تھا۔ ایک دن وہ جزیرہ مانٹی کرسٹو پہنچا اور ابی فیریا کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق وہاں اسے بے پناہ جواہرات ملے جس نے اس کی زندگی میں ایک نمایاں اور واضح تبدیلی پیدا کر دی۔ اس نے مارسیلز میں متعلقہ لوگوں کے حالات پتا کروائے تو پتا چلا کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور فرنینڈ، ڈینگلرس اور کیڈروس وہاں

سے جا چکے ہیں۔ مرسڈیز بھی لاپتا تھی۔ کیڈروس کے بارے میں یہ بھی علم ہوا کہ وہ بہت بدحال ہو گیا تھا اور اب ایک سرائے کا مالک ہے جہاں بہت کم مسافر جاتے ہیں۔

ایک دن جبکہ کیڈروس اپنی سرائے کے دروازے پر بیٹھا کسی مسافر کی راہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے پادری کی وضع قطع کے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پادری نے اپنا نام ابی بسونی بتایا اور اس نے ایڈمنڈ ڈینٹز کے حوالے سے بات چیت شروع کر دی اور بتایا کہ ایڈمنڈ کو پھانسی ہو گئی تھی۔ اس کے ایک ساتھی انگریز نے ایڈمنڈ کی محبت، خلوص اور تیمارداری سے متاثر ہو کر اسے ایک بیش قیمت ہیرا دیا تھا۔ جب وہ انگریز رہا تو تو ایڈمنڈ کی وصیت کے مطابق اس ہیرے کو ایڈمنڈ کے ان پانچ دوستوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ ہیرے کو دیکھ کر لالچی کیڈروس نے ابی بسونی کو بتایا کہ ایڈمنڈ کا باپ بیٹے کی جدائی میں مر گیا جبکہ ایم۔ مارل کے دو جہاز تباہ ہو گئے تھے اور جن بنکوں میں اس نے روپیہ رکھا ان کا دیوالیہ نکل گیا اور اب آخری امید ''فرعون'' ہے جو کہ تجارتی سفر پر گیا ہوا ہے۔ ڈینگلرس کے بارے میں اس نے بتایا کہ ایم۔ مارل کی سفارش سے وہ ملک کے خزانچی کے عہدے پر فائز ہوا اور ہسپانیہ سے لڑائی کے دوران اس نے بڑا روپیہ کمایا اور روپے کو بنک میں رکھ کر اسے تگنا چوگنا کر لیا۔ اپنے مہاجن کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اس نے اور شادی کی ہے جو بادشاہ کے خزانچی کی بیٹی ہے۔ اب وہ لکھ پتی ہے اور اسے کونٹ کا خطاب ملا ہے۔ فرننڈ نامعلوم اور پراسرار طریقے سے امیر ہوا۔ علی پاشا نے اپنی وصیت میں اسے اپنی جائیداد کا وارث بنا دیا۔ مرسڈیز نے تقریباً ڈیڑھ سال انتظار کرنے کے بعد آخر کار فرننڈ سے شادی کر لی۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام البرٹ ہے۔ آخر میں اس نے ولفورٹ کے بارے میں بتایا کہ اس نے میڈم دی سینٹ مران سے شادی کی اور مارسیلز سے چلا گیا۔ پادری نے ساری باتیں سنیں۔ وہ ہیرا کیڈروس کو دے دیا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ اس ہیرے کے لالچ میں کیڈروس نے پہلے اپنی بیوی اور پھر جوہری کو قتل کیا اور گرفتار ہو گیا۔ لیکن اسے کسی نامعلوم شخص نے آزاد کرا دیا۔

اس سے اگلے روز ایک انگریزی وضع قطع کا آدمی مارسیلز کے حاکم کے پاس حاضر ہوا اور ایم۔ مارل کے مالی حالات معلوم کیے۔ اسی دوران اس نے قیدیوں کے رجسٹر میں ایڈمنڈ ڈینٹز کے حالات و کوائف دیکھے۔ اس نے ایم۔ مارل کے خاندان کو تباہی سے بچایا اور ایک تھیلی میں ہیرا رکھ کر ایم۔ مارل کی بیٹی سے کہا کہ وہ فلاں جگہ سے وہ تھیلی اٹھا لے۔ فرعون جہاز کی آمد کا

دن تھا لیکن جہاز تباہ ہو گیا تھا۔ اس ہیرے کی وجہ سے ایم۔ مارل تباہ ہونے اور بے عزت ہونے سے بچ گیا۔ اس نامعلوم شخص کا کوئی اتا پتا نہ تھا جس نے انہیں بچایا تھا۔

پیرس کے دو اعلیٰ طبقے کے نوجوان کونٹ البرٹ ڈی مارسرف اور بیرن فرنز روم کے کارنیوال کو دیکھنے کے شوق میں آئے۔ البرٹ نیپلز روانہ ہو گیا اور فرنز جزیرہ البا کو دیکھنے کے شوق میں وہیں رک گیا جہاں اس نے مانٹی کرسٹو کے جزیرے کی سیر بھی کی۔ جہاز کے کپتان نے اسے جزیرے پر موجود محل کے بارے میں بتایا اور اس کے اشتیاق ظاہر کرنے پر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک محل نما غار میں لے گیا جو اپنی شان و شوکت اور سجاوٹ میں کسی محل سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات اس غار کے مالک و منتظم سے ہوئی جس نے اپنا نام سند باد ملاح بتایا۔ سند باد ملاح کے وفادار حبشی غلام علی نے ان کے سامنے رنگ رنگ کے دلکش و لذیذ کھانے اور مشروب لا کر رکھے۔ ایک خاص مشروب پینے کے بعد فرنز بے خود ہو گیا۔ جب اُسے ہوش آیا تو وہ واپس اپنے جہاز میں تھا۔ حیران ہوتا ہوا فرنز آخر کار روم آیا اور البرٹ سے ملا۔ وہاں انہیں بڑی مشکل سے کمرہ ملا لیکن پھر بھی کرائے کی گاڑی انہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ ہوٹل جس میں وہ ٹھہرے تھے وہاں ایک رئیس بھی ٹھہرا تھا جو کونٹ آف مانٹی کرسٹو کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے البرٹ اور فرنز کا گاڑی کا مسئلہ حل کیا اور اپنی گاڑی انہیں پیش کر دی۔ وہ دونوں اپنے محسن سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ آخر کار ملاقات پر فرنز کو پتا چلا کہ یہ کونٹ دراصل وہی سند باد ملاح ہے۔ سیر کے دوران البرٹ کو وہاں کے مشہور راہزن وِمپا نے تاوان کے لیے اغوا کر لیا لیکن کونٹ کی بروقت مداخلت سے نہ صرف البرٹ آزاد ہو گیا بلکہ وِمپا نے انہیں بہت عزت بھی دی۔ فرنز اور البرٹ نے کونٹ کا شکریہ ادا کیا اور اسے پیرس آنے کی دعوت دی جسے کونٹ نے بخوشی قبول کر لیا۔ کونٹ آف مانٹی کرسٹو حسب وعدہ اپنے غلام اور ایک نوجوان لڑکی ہیڈی کے ساتھ پیرس آیا۔ اس نے دو شاندار گھر خریدے اور وہاں رہنے لگا۔

پیرس میں کونٹ نے جس شان و شوکت اور امارت کا مظاہرہ کیا اس نے اعلیٰ طبقے اور عہدہ داروں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ڈینگلرس کونٹ سے ملاقات کرنے آیا لیکن ملازم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آج کے دن کونٹ کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔ اس کے جانے کے بعد کونٹ نے اپنے ملازم علی کو بلایا اور اسے ہدایات دیں کہ ڈینگلرس جس بگھی پر آیا ہے اس میں جتے

گھوڑے دگنی قیمت پر خرید لو۔ سولہ ہزار کے گھوڑے بتیس ہزار میں خرید کر اس نے تحفتہً میڈم ڈینگلرس کو دے دیے۔ اسی طرح ایک مصنوعی حادثے میں اس نے میڈم ولفورٹ اور اس کے بیٹے کی جان بچائی جس پر میڈم ولفورٹ کونٹ کی بہت شکر گزار تھی۔ اس کی ایک سوتیلی بیٹی بھی تھی جس کا نام ویلنٹین تھا اور اس کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ وہ ایک نوجوان میکسی میلن سے محبت کرتی تھی۔

کونٹ آف مانٹی کرسٹو مورییل خاندان سے بھی ملا اور ایم۔ مارل کے بیٹے موریل اور بیٹی جولی سے ملا۔ دورانِ گفتگو اس نامعلوم محسن کا ذکر بھی آیا جس نے مورل خاندان کی اس وقت مدد کی تھی جب وہ تباہی کے دہانے پر تھا۔ وہ خاندان اس محسن کا شکر گزار تھا۔ کونٹ نے بتایا کہ وہ ایک انگریز کو جانتا ہے جس نے مارل خاندان کی مدد کی تھی لیکن وہ اب وفات پا چکا ہے۔

میڈم ولفورٹ سے گفتگو کے دوران اس تریاق کی اثر پذیری کی بات ہوئی جس سے کونٹ میڈم ولفورٹ کے بیٹے اڈورڈ کو ہوش میں لایا تھا۔ کونٹ نے بتایا کہ اس کا ایک قطرہ تریاق اور تین سے چھ یا دس قطرے سخت زہر ہیں۔ میڈم کی فرمائش اور پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کونٹ نے اس کا نسخہ اسے بھجوا دیا۔

کونٹ، علی اور ہیڈی کے ساتھ تماشا گاہ میں گیا وہاں اس نے میڈم ڈینگلرس اور اسکی بیٹی یوجین سے ملاقات کی اور کونٹ ڈی مارسرف سے بھی ملا جس نے بتایا کہ وہ علی پاشا کے دربار میں انسپکٹر جنرل تھا اور یہ موجودہ لڑائی اسی لبنانی سردار کی وجہ سے ہے۔ ہیڈی نے جب کونٹ ڈی مارسرف کو دیکھا تو وہ زرد ہوگئی اور کونٹ اسے فوراً وہاں سے لے گیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد البرٹ کونٹ کے گھر اس کا شکریہ ادا کرنے گیا۔ جہاں اس نے بتایا کہ یوجین سے اس کی نسبت طے ہے اور فرنز کی شادی ویلنٹین ولفرٹ سے ہونے والی ہے جب وہ پیرس واپس آئے گا۔

ایم ڈی نوٹیئر ولفورٹ کو اپنی پوتی کے دل کا حال معلوم تھا کہ وہ فرنز کے ساتھ شادی کرنے سے خوش نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بول نہیں سکتا تھا لیکن اس کی آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے ویلنٹین خوب سمجھتی تھی۔ ایک وصیت میں اس نے اپنی جائیداد ویلنٹین اور اس کے شوہر کے نام لگا دی جس پر میڈم ولفورٹ کا ردعمل خاصا سخت تھا کیونکہ وہ اُس جائیداد کو اپنے بیٹے کے نام کروانا چاہتی تھی۔

پیرس میں کونٹ نے مختلف طریقوں اور ذریعوں سے ولفورٹ اور ڈینگلرس کو سخت مالی

دھچکا پہنچایا جن کی زندگی اور عزت کا دارومدار ہی پیسہ تھا۔ ایم۔ نوٹیئر نے فرنز کو گھر بلا کر ایک دستاویز کے ذریعے اسے سمجھایا کہ اس کے باپ کو اسی نے اپنے عہد میں مارا تھا۔ اس پر فرنز نے ویلنٹین سے شادی سے انکار کر دیا۔

کونٹ کی ساتھی یونانی لڑکی ہیڈی نے البرٹ اور کونٹ کو بتایا کہ اس کا باپ وہ مشہور و معروف آدمی تھا جس کو یورپ کے لوگ علی پاشا آف جینا کہا کرتے تھے۔ اسے اس کے ایک فرانسیسی جنرل نے دھوکہ دے کر مروادیا اور اس کی تمام دولت پر قبضہ کر لیا۔ اس کی ماں بھی مر گئی اور اسے ایک منڈی میں آرمینیا کے ایک دولت مند سوداگر نے خرید لیا۔ تیرہ برس کی ہوئی تو سلطان محمود کے پاس فروخت کر دیا اور اس سے آگے کونٹ نے خرید لیا۔ وہ فرانسیسی افسر البرٹ کا باپ کونٹ ڈی مارسرف فرنڈ تھا جس کے بارے میں کونٹ کے تحقیق کروانے پر پتا چلا کہ اس نے علی پاشا کو غداری اور دھوکہ دہی سے مروادیا۔ البرٹ اس تلخ حقیقت کو جان کر غصے میں آ گیا اور کونٹ سے ڈوئل لڑنے کو کہا، فرنڈ سے متعلق تمام ثبوت اخبار میں شائع ہوئے اور البرٹ کو اس ثبوت اور ہیڈی کی عدالت میں گواہی سے یقین ہو گیا کہ ہیڈی نے سچ کہا تھا۔

ایک رات کونٹ سے ملنے ایک عورت آئی۔ اس نے کہا ایڈمنڈ میرے بیٹے کو نہ مارنا، وہ البرٹ کی ماں مرسیڈیز تھی جو کونٹ ڈی مارسرف فرنڈ کی بیوی تھی۔ ایڈمنڈ نے اسے تمام واقعات بتائے کہ کس طرح فرنڈ سے انتقام لینے کی خاطر اس نے یہ ساری تحقیق کروائی۔ کونٹ نے البرٹ کو نہ مارنے کا عہد کیا۔ مرسی ڈیس نے البرٹ کو سمجھایا۔ ماں بیٹے دونوں نے تمام دولت اور شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

فرنڈ نے کونٹ سے ملاقات کی اور وہاں کونٹ آف مانٹی کرسٹو نے اسے اس کے گناہ یاد دلائے اور اپنی حقیقت بتائی۔ جب وہ واپس گھر پہنچا تو اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے بیوی اور بیٹے کو گھر چھوڑ کر جاتے دیکھا۔ ان کے جانے کے بعد فرنڈ نے خودکشی کر لی۔

ویلنٹین کی نانی میڈم سینٹ مران کے بعد نانا سینٹ مران کی موت پراسرار طریقے سے ہوئی جس کا الزام ویلنٹین پر لگایا گیا۔ موریل کے ذریعے کونٹ کو پتا چلا کہ میکسی میلن موریل اور ویلنٹین دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کونٹ نے اس معاملے کو درست کرنے کا وعدہ مورل سے کیا۔

یوجین اور اینڈریا کی شادی کے دن اینڈریا کا پول کھل گیا کہ اس نے گیس پارڈ یعنی کیڈروس کو مارا تھا کیونکہ دولت کے لالچ میں گیس پارڈ کونٹ کو مروانا چاہتا تھا لیکن کونٹ کو اس کی اطلاع بروقت ہوگئی تھی۔ اس کی حکمت عملی سے گیس پارڈ اینڈریا کے ہاتھوں مارا گیا۔ اینڈریا کو کونٹ ہی نے پیرس بلوایا تھا اور وہ اس کے منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ اینڈریا فرار ہو گیا اور یوجین اپنی دوست آرسیلی کے ساتھ گھر سے چلی گئی۔

ویلنٹین بیمار ہوگئی۔ اس کی سوتیلی ماں اسے جو دوا پلاتی رہی اس سے اس کی طبیعت اور بھی خراب ہوگئی۔ کونٹ نے جب اپنے طور پر اس کا پتا چلایا تو اسے علم ہوا کہ میڈم ولفورٹ اسے زہر دیتی رہی ہے اور ایک دن جب وہ اس کا کام تمام کرنے کے لیے کافی مقدار میں زہر گلاس میں ڈال کر پلانا چاہتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں کونٹ نے ویلنٹین کو وہ مشروب پینے سے منع کیا اور گلاس کو خالی کر دیا۔ میڈم ولفورٹ جب کمرے میں آئی تو اس نے سمجھا کہ ویلنٹین مر گئی ہے۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے وہ دوڑی گئی۔ اس نے دیکھا کہ معمول کے مطابق ڈاکٹر اسی طرف آرہا ہے۔ جب وہ ڈاکٹر کے ہمراہ ویلنٹین کے کمرے میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ وہ گلاس جو خالی تھا اب اُس میں زہر کچھ مقدار میں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے گلاس میں زہر کی موجودگی کی تصدیق کر دی۔ ایک شخص ابی کا لباس پہنے آیا، وہ اس کمرے میں داخل ہو گیا جو کہ ویلنٹین کا تھا۔ اس کے جنازے پر کونٹ موریل سے ملا لیکن موریل بہت ناامید تھا۔ وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کونٹ بھی اس کے پیچھے گیا جہاں اس نے موریل کو خودکشی کے ارادے سے باز رکھا اور بتایا کہ وہی ایڈمنڈ ڈینٹز ہے۔ اس نے موریل سے ایک ماہ تک زندہ رہنے کا عہدہ لیا۔

کونٹ ڈینگلرس سے ملا اور ساٹھ لاکھ کی رسید اسے دے کر ساٹھ لاکھ ساتھ لے گیا جو کہ دراصل ڈینگلرس نے شفاخانے کے مالک کو دیے تھے۔ اس نے ساری رسیدیں، روپیہ سمیٹا اور پیرس سے فرار ہو گیا۔

ولفورٹ لوگوں کی آراء اور باتوں سے مجبور ہو کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس پر مقدمہ چلانے کے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ عدالت میں اینڈریا سے سوالات اور تفتیش کے دوران پتا چلا کہ وہ ولفورٹ اور میڈم ڈینگلرس کی ناجائز اولاد ہے جسے پیدا ہوتے ہی ولفورٹ نے زمین میں دفن کر دینا چاہا تھا لیکن اس کے ایک ملازم نے، جس سے ولفورٹ نے زیادتی کی تھی، ولفورٹ

کو زخمی کر کے دولت کی غلط فہمی میں اس بچے کو اٹھایا اور یوں وہ بچہ پھرتے پھراتے کیڈروس کے پاس آ گیا۔ دولت کے لالچ میں اینڈریا یعنی بنی ڈٹو نے کیڈروس کو مار دیا تھا۔ یہ حقائق سن کر ولفورٹ کے حواس باختہ ہو گئے۔ وہ دیوانوں کی طرح عدالت سے نکلا۔ راستے میں اسے اپنی بیوی اور بچے کا خیال آیا تو وہ تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس نے دیکھا کہ میڈم ولفورٹ نے اپنے بیٹے کو زہر دے کر آخر میں اپنی زندگی کا خاتمہ بھی کر لیا تھا۔ وہ اپنے باپ ایم نورٹیئر کے کمرے میں گیا جہاں ابی بسونی موجود تھا جس نے اسے ماضی کی زیادتیاں یاد دلائیں کہ کس طرح اس نے معصوم بے گناہ ایڈمنڈ کو قید میں ڈلوا دیا تھا۔ یہ سب سن کر ولفورٹ کے رہے سہے حواس جاتے رہے اور وہ مکمل طور پر دیوانہ ہو گیا۔ ہیڈی چونکہ پہلے ہی پیرس سے روانہ ہو چکی تھی اب کونٹ نے موریل کو ساتھ لیا اور مارسیلز آ گیا۔ ساحل پر انہیں مرسی ڈیس نظر آئی جو اپنے بیٹے البرٹ کو رخصت کر رہی تھی۔ موریل سے رخصت ہو کر وہ اس گھر میں آیا جہاں کبھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں مرسڈیز سے مل کر اس نے البرٹ کے حوالے سے مرسڈیز کو تسلی دی۔ اس کے جواب میں مرسڈیز نے ندامت اور شرمندگی کا اظہار کیا کہ وہ اس کا انتظار نہ کر سکی تھی۔۔ ایڈمنڈ نے اسے تسلی دی کہ وہ شرمندہ نہ ہو۔ اللہ نے اسے اس کام کے لیے زندگی دی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکے۔

مرسڈیز سے رخصت ہو کر وہ بندرگاہ واپس آیا اور اس نے قلعہ ڈی ایف کو دیکھا جو کہ اب ویران تھا۔ جولائی کے انقلاب کے بعد اس میں قیدی نہ رکھے جاتے تھے، صرف ایک گارد رہتی تھی جس کی غرض یہ تھی کہ اشیا کے محصول کے بغیر چوری لانے کی روک کریں۔ ایک محافظ کی نگرانی میں وہ اس جگہ گیا جہاں کبھی وہ قید تھا۔ اس محافظ نے اسے دو قیدیوں ایڈمنڈ اور ابی فیریا کی داستان سنائی جس پر ایڈمنڈ دل ہی دل میں اپنے روحانی باپ فیریا کا شکر گزار ہوا جس نے اسے علم، آزادی اور دولت کے راستے سمجھائے تھے۔ فیریا نے دورانِ قید کپڑے کے ٹکڑوں پر اٹلی کے بارے میں جو کتاب لکھی تھی، محافظ سے وہ کتاب دس ہزار کے عوض لے لی۔ وہاں سے رخصت ہو کر وہ قبرستان گیا جہاں موریل کو اس نے ایک مرتبہ پھر تسلی دی اور اسے ۵ اکتوبر کو جزیرہ مانٹی کرسٹو پہنچنے کے لیے کہا۔ موریل سے مل کر ایڈمنڈ اٹلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ڈینگلرس تمام روپے پیسے کے ساتھ فرار ہو کر اٹلی پہنچا تو وہاں وامپا کے آدمیوں نے

اسے اغوا کرلیا۔ وہ روپے پیسے کے عوض اسے روز کھانا، پانی اور شراب دیتے تھے۔ آخر کار جب اس کی حالت بہت خراب ہوگئی تو اسے ایک آواز آئی جو اسے توبہ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ ایڈمنڈ تھا جس نے ڈینگلرس کو اس کے مظالم یاد دلائے۔ ڈینگلرس نے توبہ کرلی اور ایڈمنڈ کے کہنے پر وامپا نے اسے چھوڑ دیا۔ رہا ہوکر جب ڈینگلرس ایک ندی کے کنارے پہنچا۔ اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھا کہ اس کے سارے بال سفید ہوگئے ہیں۔

پانچ اکتوبر کو جزیرہ مانٹی کرسٹو میں کونٹ، موریل سے ملا جہاں وہ زندگی سے مایوس اور ناامید موجود تھا۔ چونکہ ایک مہینے کی مہلت ختم ہو چکی تھی اس لیے موریل کے کہنے پر ایڈمنڈ نے اسے کچھ دوائی دی جس سے موریل پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کیفیت میں اسے ویلنٹین نظر آئی۔ کونٹ ان سب کو وہیں چھوڑ کر جا رہا تھا کہ ہیڈی نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ اس اقرار و عہد پر ایڈمنڈ کا دل نرم پڑ گیا۔ ہیڈی کے ساتھ وہ وہاں سے چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد موریل کو ہوش آیا تو اس نے ویلنٹین کو دیکھا جس نے اسے ایڈمنڈ کا خط دیا۔ اس نے ان دونوں کو پیرس واپس جانے کے لیے کہا تھا جہاں ویلنٹین کا دادا ایم نورٹیئر ان کا منتظر تھا۔ ایڈمنڈ نے پیرس میں خریدے ہوئے دونوں شاندار مکان انہیں دے دیے تھے۔ موریل نے ایڈمنڈ کو واپس بلانا چاہا لیکن ویلنٹین نے موریل کو ایڈمنڈ کے خط کے حوالے سے تسلی دی کہ ایڈمنڈ نے خط میں آخری سطور یہ درج کی تھیں:

''ساری انسانی دانائی انہیں دو لفظوں میں بھری ہوئی ہے کہ امید رکھو اور انتظار کرو۔''

ناول کے کردار:

ایڈمنڈ ڈینٹز

ناول کا مرکزی کردار ہے۔ تمام واقعات اور کردار اسی ایک کردار کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ناول کا ہیرو ایڈمنڈ ڈینٹز پے در پے کئی حادثات کا شکار ہوتا ہے اور آخر کار ایک کامیاب ہیرو کی طرح کئی فتوحات اس کے حصے میں آتی ہیں۔ اس کردار میں وہ ارتقاء نظر آتا ہے جو کسی کردار کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے۔ ناول کے آغاز میں وہ ہمیں ایک سادہ لوح، معصوم،

درگزر کرنے والا اور محبت کرنے والا انیس سالہ نوجوان کے روپ میں دکھائی دیتا ہے جسے اپنے باپ اور اپنی محبت مرسڈیز کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ ڈینگلرس کے کینے سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ کیڈروس جو کہ اس کا ہمسایہ تھا اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے باپ سے ادھار کی رقم کا شدت سے تقاضا کرتا ہے جو ایڈمنڈ ڈینٹز نے اس سے لے رکھی تھی۔ ڈینٹز اسے وہ رقم ادا کر دیتا ہے اور نتیجۃً اس کے پاس اپنے خرچ کے لیے ناکافی روپے بچتے ہیں۔ ایڈمنڈ اپنے باپ کو ایک معقول رقم اسی لیے دے کر گیا تھا کہ وہ تین ماہ کے لیے بحری سفر پر جا رہا تھا۔ کیڈروس کا ادھار چکانے کے بعد ڈینٹز بڑی مشکل سے بقیہ رقم میں گزر بسر کرتا ہے۔ تین ماہ کے لمبے سفر کے بعد جب ایڈمنڈ کو کیڈروس کی کمینگی کا علم ہوتا ہے تو غصے کی ایک ہلکی سی لہر اس کے دل میں اٹھتی ہے لیکن چونکہ وہ معاف کر دینے کی صفت رکھتا ہے اس لیے نہ صرف وہ کیڈروس سے خوش دلی سے ملتا ہے بلکہ اسے کچھ سکے ادھار دینے کی پیش کش بھی کر دیتا ہے۔

سیاست سے اس کی لاعلمی کا ایک ثبوت ہمیں اس واقعے سے ملتا ہے جو کہ ناول کی بنیاد ہے۔ فرانس میں لوئیس شانزدہم کی حکومت ہے اور نپولین کو البا میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اس دور میں نپولین کے وفادار قابل گردن زنی سمجھے جاتے تھے۔ دوران سفر جہاز کے کپتان لیکلیئر کی طبیعت خراب ہوئی اور اس نے مرنے سے پہلے ایڈمنڈ کو وصیت کی کہ وہ جزیرہ البا میں جائے اور گرینڈ مارشل کو ایک پیکٹ پہنچا دے۔ ملاقات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اس نے ایک انگوٹھی بھی ایڈمنڈ کو دی۔ کپتان لیکلیئر مر گیا اور اس کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایڈمنڈ نے اپنے ساتھی کارکن ڈینگلرس کی مخالفت مول لی اور سیاسی حالات کو مدنظر رکھے بغیر وہ البا اترا، گرینڈ مارشل سے ملاقات کی جس نے اسے ایک خط پیرس پہنچانے کے لیے دیا۔ اور پھر اسی خط نے ایڈمنڈ کی زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔

ایڈمنڈ کا کردار ایک محبت کرنے والے نوجوان کا ہے۔ وہ اپنے باپ کو سہولت اور آرام پہنچانے کے خواب دیکھتا ہے اور مرسڈیز کے ساتھ شادی کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ آخر کار شادی کا دن آن پہنچا اور اسی دن وہ ڈینگلرس، کیڈروس اور فرننڈ کی سازش کا شکار ہو کر قید کر لیا گیا۔

ایم۔ ڈی ولفورٹ نے ایڈمنڈ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا اور اسے قلعہ ڈی ایف میں قید کروادیا لیکن اس کے باوجود ایڈمنڈ کے دل میں کسی کے خلاف کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہوا۔ وہ قید میں اپنی بے گناہی کے بارے میں سوچتا رہتا اور خدا سے دعائیں مانگتے مانگتے آخر کار جب مایوسی کا شکار ہونے لگا تو اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں قیدابی فیریا اسکے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا جس نے اسے نہ صرف حالات سے باخبر کیا بلکہ واقعات کی روشنی میں اس کے دشمنوں کی نشاندہی بھی کی۔ اس نے ایڈمنڈ کو وہ تعلیم بھی دی جس سے ایڈمنڈ کے دل ودماغ روشن ہو گئے۔ ایڈمنڈ فیریا کا اتنا احسان مند تھا اور شکر گزار تھا کہ ایک رات جب دونوں نے بھاگنے کی تیاری کر لی تھی تو عین اسی موقع پر فیریا کو سخت دورہ پڑا۔ ایڈمنڈ کے لیے سنہرا موقع تھا کہ وہ فیریا کو وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا لیکن وہ احسان فراموش نہ تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے محسن کی تیمارداری کی بلکہ اس نے یہ عہد بھی کیا کہ وہ فیریا کے بغیر فرار نہ ہوگا۔ اسی قید خانے میں اس نے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا عہد بھی خود سے کیا۔ فیریا نے اس کی محبتوں کے عوض اسے تعلیم بھی دی اور مانٹی کرسٹو کے خزانے کا راز بھی بتایا۔

فیریا کی اچانک موت کے بعد اسے قید سے فرار ہونے کا موقعہ ملا اور اس نے آخر کار چودہ سال بعد اس قید سے نجات حاصل کر کے مانٹی کرسٹو کا خزانہ بھی پالیا۔ یہاں سے ایڈمنڈ کا کردار ایک مختلف روپ میں سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی دولت کے بل پر معلوم کرواتا ہے کہ اس کا باپ مر گیا ہے اور اس کی محبوبہ نے اس کی جدائی کو موت پر محمول کرتے ہوئے آخر کار اپنے چچازاد فرننڈ سے شادی کر لی ہے اور وہ وہاں سے چلے گئے ہیں۔

قید سے رہائی پانے کے بعد ایڈمنڈ ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ فیریا کی دی ہوئی تعلیم، دشمنوں سے بدلہ لینے کا عہد، بے پناہ دولت کا مالک، روپے پیسے کو دریا دلی سے لٹاتا ہوا ایک ایسے امیر شخص کے روپ میں سامنے آتا ہے جو دانا و عاقل بھی ہے اور معاملہ فہم بھی۔ اپنے دشمنوں کی کمزوری کو مدنظر رکھ کر اسے اپنے انتقام کا نشانہ بناتا ہے۔ اس تمام مرحلے میں وہ سمگلروں سے بھی راہ ورسم رکھتا ہے، ڈاکوؤں سے بھی اس کے تعلقات ہیں، امراء کی محفلوں میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ غرض کہ وہ ایک ایسی پراسرار شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ آخر میں وہ اپنی ساری دولت موریل اور ویلنٹین کے سپرد کرتا ہے اور خود کینڈی کے ہمراہ چلا

جاتا ہے۔

مرسڈیز

مرسڈیز کا کردار اگرچہ ناول میں زیادہ نہیں ہے لیکن جب وہ پہلی بار ناول میں ہمارے سامنے آتی ہے تو وہ ایک خوب صورت لڑکی کے روپ میں اپنے چچازاد بھائی سے محوِ گفتگو نظر آتی ہے۔ مرسڈیز فرنینڈ کی شادی کی پیش کش ٹھکرا دیتی ہے کیونکہ وہ ایڈمنڈ سے محبت کرتی ہے اور اس محبت کی بنا پر وہ ایڈمنڈ کی عدم موجودگی میں اور پھر گمشدگی کے بعد اس کے باپ ڈینٹز کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کے مرتے دم تک اس کا خیال رکھتی ہے۔ ایڈمنڈ ڈینٹز کی گمشدگی پر وہ اس کا انتظار کرتی ہے، اس کے لیے بے چین رہتی ہے اور جب اس کی امید ختم ہو جاتی ہے تو وہ فرنینڈ سے شادی کر لیتی ہے۔

پیرس میں کونٹ کے روپ میں کوئی بھی ایڈمنڈ کو پہچان نہیں سکتا لیکن مرسڈیز اس کو پہچان لیتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ کس طرح وہ اس کے غائب ہونے پر پریشان اور ہراساں تھی اور کوئی راہ نہ پا کر آخر کار فرنینڈ کی شادی کی پیش کش قبول کر لی تھی۔ معاشی خوشحالی کے باوجود ماضی کی یادوں نے اس کی خوبصورتی کو دھندلا دیا تھا۔ اسے جب ایڈمنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ فرنینڈ نے ساری دولت دھوکے سے حاصل کی ہے تو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ پیرس چھوڑنے کا ارادہ کرتی ہے جس پر ایڈمنڈ اسے مارسیلز میں اس مکان میں جانے کی صلاح دیتا ہے جہاں کبھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔

مرسڈیز کا کردار ایک مکمل نسوانی کردار ہے۔ خوبصورتی اور ناز و ادا سے بھرپور۔ وہ ایڈمنڈ کی عدم موجودگی میں اس کی وفادار رہتی ہے اور فرنینڈ کی محبت اور ترغیب کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ایڈمنڈ سے شادی والے دن وہ اتنی ہی خوش ہوتی ہے جتنا کہ ایک لڑکی اپنے محبوب کے مل جانے پر خوش ہو سکتی ہے۔ اور پھر شادی والے دن ہی ایڈمنڈ کی گرفتاری پر وہ ولفورٹ سے ملتی ہے، اس سے ایڈمنڈ کے بارے میں دریافت کرتی ہے اور اس کی سفارش بھی کرتی ہے۔ وہ کافی عرصہ تک ایڈمنڈ کی راہ دیکھتی رہتی ہے لیکن زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اور ناامید ہو کر وہ فرنینڈ سے شادی تو کر لیتی ہے لیکن ایڈمنڈ کی یادوں کو فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پیرس میں کونٹ آف مانٹی کرسٹو کے روپ میں کوئی شخص اسے شناخت نہیں کر پاتا تو مرسڈیز اسے پہچان لیتی ہے۔

ایم۔مورل

ایم۔مورل فرعون نامی جہاز کا مالک تھا جس پر ایڈمنڈ ڈینٹز کام کرتا تھا۔مورل ہمدرد اور اپنے کارکنان سے تعاون کرنے والا اور ان کے لیے جدوجہد کرنے والا ہے۔وہ قدر شناس شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ایڈمنڈ جب اسے بتاتا ہے کہ کس طرح اس نے کیپٹن لیکلیئر کی آخر خواہش کو پورا کیا اور ڈینگلرس نے اس کی کیسے مخالفت کی تو ان باتوں کو ثانوی سمجھ کر اس نے ایڈمنڈ کی کارکردگی کو سراہا اور اسے کیپٹن کا عہدہ دینے کا وعدہ کیا۔اس نے ایڈمنڈ کو رات کے کھانے پر بلایا اور اسے روپے پیسے کی امداد کی پیش کش بھی کی۔

جب ایڈمنڈ کو گرفتار کر کے لے جایا گیا تو وہ خصوصی طور پر ایم۔ڈی ولفورٹ سے ملا اور اسے ایڈمنڈ کی صفائی میں دلائل دیے۔اسی طرح جب نپولین کا دورِ حکومت آیا تو وہ پھر ولفورٹ کے پاس گیا اور بے حد اصرار سے اس نے ڈپٹی اٹارنی کے نام خط لکھوایا جس میں ایڈمنڈ کی رہائی کی درخواست پیش کی گئی تھی۔اگرچہ ولفورٹ نے حسب سابق بددیانتی کی اور وہ خط بھجوانے کے بجائے اپنے پاس ہی رکھ لیا تاہم ایم۔مارل نے اپنے طور پر پوری کوشش کی۔

ایم۔مارل ایک خوددار اور غیرت مند کردار ہے۔وہ جب اچھی معاشی حالت میں تھا تو اپنے کارکنوں کی مدد کرتا اور جب خود اس پر غربت کا عالم طاری ہوا اور قرض چکانے کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے تو وہ سخت ناامیدی کی حالت میں بھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کا روادار نہ ہوا۔

اگرچہ یہ کردار بہت مختصر ہے لیکن انسانیت اور ہمدردی سے بھرپور یہ کردار اچھے انسانی کردار کا نمائندہ کردار ہے۔

ڈینگلرس

فرعون نامی جہاز کا منتظم ڈینگلرس تھا جو کہ ایڈمنڈ ڈینٹز کے ماتحت کام کرتا تھا اور اس سے حسد کی بنا پر اس کو کسی نہ کسی معاملے میں پھنسانے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔البا اور گرینڈ

مارشل والے واقعے کو اس نے اپنے ذہن میں رکھا اور جب کیپٹن کی وفات کے بعد ایڈمنڈ کو کپتان بنانے کا ارادہ کیا گیا تو اس کی آتش حسد بھڑک اٹھی۔ اس نے جہاز کے مالک کو ایڈمنڈ سے متنفر کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ کیڈروس اور فرنٹ کے ساتھ مل کر ایسا منصوبہ بنایا جس نے ایڈمنڈ کے بچاؤ کے سارے راستے مسدود کر دیے۔

پلاٹ کو آگے بڑھانے میں ڈینگلرس کے حسد نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس نے اپنے ہی جیسے منفی کرداروں کیڈروس اور فرنٹ سے راہ رسم بڑھا کر ایڈمنڈ کے خلاف ایسا منصوبہ بنایا جو بے داغ تھا۔ اس وقت کے سیاسی حالات اس کے مدنظر تھے جن کو بنیاد بنا کر اس نے ایک خط حاکم اعلیٰ کی عدالت میں لکھا اور ایڈمنڈ کو نپولین کا طرفدار ثابت کیا۔ اپنے منصوبے کی کامیابی کا اسے اس حد تک یقین تھا کہ ایڈمنڈ اور مرسڈیز کی شادی کی ضیافت کے موقع پر وہ منتظر تھا کہ کب ایڈمنڈ کی گرفتاری کے احکامات آتے ہیں۔

نپولین کے عہد میں اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ ایڈمنڈ اب واپس آ کر اس سے بدلہ لے گا لیکن یہی خوف اس کی آئندہ ترقی کا ضامن بنا۔ وہ ایم۔ مارل کی سفارش سے ہسپانیہ کے سوداگر کے پاس نوکر ہوتا ہے اور پھر وہ بہت روپیہ کماتا ہے۔ اس روپے کو بنک میں رکھ کر دوگنا، تگنا کر لیتا ہے۔ مہاجن کی بیوی کے ساتھ شادی کرتا ہے اور پھر اسکے بعد دوسری شادی بھی کرتا ہے۔ اپنی دولت کی وجہ سے اسے کونٹ کا خطاب بھی مل جاتا ہے۔ یہ کردار بنیادی طور پر عہدے اور روپے پیسے کے لالچی شخص کا کردار ہے جو آخر میں اپنے لالچ کی وجہ ہی سے نقصان اٹھاتا ہے۔ یہی روپیہ اس کے لیے وبال بن جاتا ہے جب وامپا کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ آخر میں ایڈمنڈ اسے اس کے گناہ یاد دلاتا ہے۔ توبہ کرنے پر اسے وامپا سے رہائی مل جاتی ہے۔

کیڈروس

ایڈمنڈ کا ہمسایہ کیڈروس درزی تھا اور شراب و روپے پیسے کا رسیا تھا۔ ایڈمنڈ کی عدم موجودگی میں اس کے باپ سے ادھار کی رقم کا تقاضا کرنا اس کی فطرت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ایک

موقع پرست شخص تھا۔ شراب خانے میں بیٹھ کر اگر چہ وہ ڈینگلرس اور فرننڈ کی سازش کی مخالفت بھی کرتا ہے لیکن مفت ملی ہوئی شراب اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری کر دیتی ہے۔ شادی کی ضیافت میں جب سپاہی ایڈمنڈ کو گرفتار کرنے آتے ہیں تو وہ مضطرب ہوتا ہے لیکن ڈینگلرس کے ڈرانے سے ڈر جاتا ہے۔

جب وہ ایک ویران سرائے کا مالک تھا اور سخت بدحال اور غربت کے عالم میں تھا۔ ایڈمنڈ اسے پادری کے روپ میں ملتا ہے تو ہیرے کے لالچ میں وہ اسے ان تمام دشمنوں کے حالات بتاتا ہے جنھوں نے ایڈمنڈ کو نقصان پہنچایا تھا۔ ہیرا ملنے پر وہ اپنی بیوی اور جوہری کو قتل کرتا ہے۔ پیرس میں اپنے لے پالک بیٹے ڈٹو یعنی اینڈریا کو کونٹ کو قتل کرنے کے لیے بھیجتا ہے لیکن اس سازش کا خود ہی شکار ہو جاتا ہے اور اینڈریا کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ لالچی کردار عبرتناک انجام سے دوچار ہو کر نیکی اور سچ کی فتح کو مزید مضبوط کر دیتا ہے۔ اس کے قتل کے ساتھ ہی ایڈمنڈ ڈینٹز کے انتقام کا ایک مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔

فرننڈ

فرننڈ کا کردار منفی کردار ہے کیونکہ وہ مثبت قدروں پر یقین رکھنے کے بجائے چور راستوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ جذباتی، جوشیلا، جلد باز، دغاباز اور دوسروں کے کہے میں آ کر غلط کام کرنے پر تیار ہو جانے والا نوجوان ہے۔ وہ مرسڈیز کا چچازاد بھائی ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ ایڈمنڈ کے حسد میں فرننڈ، ڈینگلرس کے ساتھ مل کر ایڈمنڈ کے خلاف سازش میں شامل ہوتا ہے۔

فرننڈ کے کردار کا ایک اور رخ اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ علی پاشا کو دھوکہ دے کر نہ صرف اسے قتل کرتا ہے بلکہ اس کی ساری جائیداد پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ وہ کونٹ ڈی مارسرف کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ جب کونٹ پیرس میں آ کر اس کی دھوکہ دہی کی تحقیق کروا کے اسے مجرم ثابت کر دیتا ہے تو بھی فرننڈ شرمندہ نہیں ہوتا اور اسے ملنے چلا جاتا ہے جہاں پہنچ کر اسے یہ جان کر دھچکا لگتا ہے کہ وہ کونٹ کے روپ میں دراصل ایڈمنڈ ہے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنی محبوب بیوی اور پیارے بیٹے کو گھر چھوڑ کر جاتے دیکھتا ہے۔ جیسے اس کی زندگی کا مقصد ہی ختم ہو

جاتا ہے۔ ساری اچھی شہرت بدنامی میں بدل جاتی ہے۔ ذاتی طور پر وہ تنہا ہو گیا تھا اس لیے وہ خود کشی کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے کیے کی سزا خود اپنے آپ ہی کو دے دیتا ہے۔

ایم۔ ڈی۔ ولفورٹ

ولفورٹ فرانس کی سیاست کا ایک اہم مہرہ ہے جو اس ناول میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ سرگرم عمل نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا رخ اور تعارف اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب وہ اپنی شادی کی ضیافت میں بیٹھا مہمانوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی باتوں سے وہ شہنشاہ کا حامی اور منصف دکھائی دیتا ہے۔ جب اسے ایڈمنڈ کے بارے میں اطلاع ملتی ہے، وہ اس معاملے کی تفتیش کرتا ہے تو ذاتی مفاد کی خاطر ایڈمنڈ کو اس بری طرح پھنساتا ہے کہ نہ صرف خود صاف بچ نکلتا ہے بلکہ نپولین کے حامی اپنے باپ ایم۔ نورٹیئر کے بھی صاف بچا لیتا ہے۔ پھر ایک ہی تیر سے تیسرا شکار اس طرح کرتا ہے کہ لوئیس شانزدہم کے پاس خود جاتا ہے اور اسے نپولین کی البا سے روانگی کی اطلاع دیتا ہے۔

اپنے باپ کی وجہ سے وہ نپولین کے عہدِ حکومت میں بھی وہ اپنے عہدے پر قائم رہتا ہے اور اختیار ہونے اور ایم۔ مارل کی سفارش کے باوجود اس کی رعونت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دوبارہ بادشاہ کی حکومت آنے پر وہ سینٹ ڈی مران کی بیٹی سے شادی کرتا ہے تاکہ اس کی سیاسی حیثیت مزید مستحکم ہو جائے۔ اس کی دوسری بیوی اپنی سوتیلی بیٹی کو زہر دے کر مار ڈالنے کا قصد کرتی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی رہتی ہے لیکن ولفورٹ کو اس وقت بھی بیٹی کی محبت کے بجائے لوگوں کی آرا اور اپنی حیثیت کی پروا ہوتی ہے۔ بیٹی کی موت، دوسری بیوی اور بیٹے کی ہلاکت، میڈم ڈینگلرس سے ناجائز تعلق اور ناجائز بیٹے کا بھری عدالت میں انکشاف اسے اس حد تک رسوا کر دیتا ہے کہ وہ پاگل ہو جاتا ہے۔

ابی فیریا

اس ناول میں ابی فیریا کا کردار داستان کی نیک دل پریوں جیسا ہے جو مشکل میں گرفتار شہزادے کی نیکی سے متاثر ہو کر اس کی مدد کرتی ہیں۔ فیریا اٹلی کا ایک عالم فاضل شخص تھا جس نے قید میں رہتے ہوئے اپنے علم و فضل کی بدولت اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ وہی علم اس نے ایڈمنڈ کو منتقل کر دیا۔ زیادہ عمر اور جسامت کمزور ہونے کے باوجود اس نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا اور مضبوط دیوار میں شگاف کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور کوشش بھی خود ہی کی۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے وہ ایڈمنڈ کی کوٹھڑی تک جا پہنچا۔ وہ محتاط ہو گیا اور پھر اس کے بعد ایڈمنڈ کی کوششوں سے وہ دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ فیریا نے نہ صرف نوجوان ایڈمنڈ کو تسلی دی بلکہ اسے امید دلائی اور علم کے خزانے کے ساتھ ساتھ اسے جزیرہ مانٹی کرسٹو کے خزانے کا راز بھی بتایا۔

ابی فیریا ایک عالم اور تجربہ کار شخص تھا۔ وہ ایڈمنڈ کی سادہ لوحی، وفاداری اور تیمارداری سے بہت متاثر ہوا۔ اسے بیٹوں جیسی محبت دی۔ ایڈمنڈ کی تیمارداری سے خوش اور متاثر ہو کر اس نے ایڈمنڈ کو اپنے اس راز میں شریک کر لیا جو اس نے کسی کو نہ بتایا تھا یعنی مانٹی کرسٹو کے خزانے کا راز۔

ترجمے کی خصوصیات:

غلام قادر فصیح نے اس دور میں انگریزی ناول کا اردو ترجمہ کیا جبکہ ترجمہ ابھی اپنی ابتدائی منازل میں تھا۔ اس کے اصول ابھی متعین نہ ہوئے تھے۔ تراجم پر توجہ اس نقطہ نظر سے دی جاتی تھی کہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوی ادب کے تراجم اردو میں کیے جائیں تا کہ اردو میں تراجم کے ذریعے مغربی خیالات سے استفادہ کیا جا سکے۔ ترجمے میں ان باریکیوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا تھا جو کہ آج کل کے تراجم کا خاصا ہے۔ اس سب کے باوجود فصیح نے اس ناول کا جو ترجمہ کیا ہے وہ آج بھی بہت سے تراجم سے نسبتاً بہتر ہے۔ نہ تو انہوں نے پیرس کو لاہور بنایا ہے اور نہ ہی فرانسیسی کرداروں کو ہندوستانیوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔

ذیل میں ''موتیوں کا جزیرہ'' کے ترجمے کی چند خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔

یا محاورہ ترجمہ:

ترجمہ کرتے ہوئے فصیح نے لفظی ترجمے کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور با محاورہ ترجمہ کو بھی۔ ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے اردو الفاظ کی موزونیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ ترجمہ پڑھتے ہوئے قاری کو با محاورہ زبان ملتی ہے جس میں ادبی چاشنی موجود ہے۔

Is this not more a poor sailor like me could have hoped for?

کیا میرے جیسے غریب ملاح کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ نہیں ہے؟

If he has forgottof you.

اگر اس نے تمہیں فراموش کر دیا۔

Rushing towards the door.

دروازے کی طرف جھپٹ کر

Flush of anger mounted to his brow.

اس کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔

His three cornered hat hung a streaming knot of white and blue ribbons.

اس کی سہ گوشہ ٹوپی سے سفید اور نیلگوں فیتوں کی ایک لمبی خوبصورت جھالر لٹک رہی تھی۔

افسانوی ادب کا ترجمہ اس لحاظ سے نسبتاً آسان بھی ہوتا ہے کہ اس میں پلاٹ، کردار اور مکالموں کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ جذبات کے اظہار کے لیے ادب میں کچھ الفاظ مخصوص ہوتے ہیں جن کو بیان کر کے وہی مطلب ادا کیا جا سکتا ہے جو کہ اصل متن میں مصنف کا مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً ذیل کی مثال میں حسرت وخواہش کے جس جذبے کا اظہار مقصود تھا اسے بڑی مہارت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

I only wish my name were Dantes for a day.

کاش کہ اس کی جگہ پر میں ہوتا۔

اب بظاہر یہ ترجمہ لفظی نہیں ہے، بامحاورہ بھی نہیں ہے لیکن اس سے جو مطلب اور تاثر پیدا ہوا ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ تراجم میں ایک اور اہم مسئلہ محاورات اور اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ اگر ترجمہ شدہ زبان میں وہ اصطلاحات یا ان کا ترجمہ رائج ہے تو ان کو اسی طرح بیان کرنا چاہیے لیکن مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں اردو میں ہمیں ان اصطلاحات و محاورات کا ترجمہ نہیں ملتا۔ اس مشکل کو بھی غلام قادر فصیح نے خوش اسلوبی سے نباہا ہے۔

To throw a veil over it.

گزشتہ راصلوٰۃ کہنا چاہیے۔

Now be off to see your father.

اب اپنے باپ کو ملنے میں توقف نہ کرو۔

معنی میں تبدیلی:

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر زبان میں رائج الفاظ مختلف ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ نہ صرف اس زبان سے مخصوص ہوتے ہیں بلکہ متعلقہ زبان کی تاریخ وتہذیب کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا جاتا ہے تو کیا ترجمہ لفظی ہونا چاہیے؟ یا اس کو اپنے معانی میں ادا کر دینا اچھا ہوتا ہے؟ بعض اوقات تو پہلا اور دوسرا طریقہ انفرادی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ بعض اوقات دونوں طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے فرق یہ پڑتا ہے کہ ترجمہ لفظی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ غلام قادر فصیح نے بھی اس طریقے کو استعمال کیا ہے۔ انہوں نے انگریزی الفاظ کو اردو میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ترجمے کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ زیادہ واضح اور بامحاورہ زبان پڑھنے کو ملتی ہے۔ مثال کے لیے چند جملے درج ذیل ہیں:

In the grip of the demon of hatred

آتش حسد میں جلتے ہوئے

Throbbing heart

جنبش کرتا ہوا دل

Half Opened

نیم کشادہ

Suddenly he felt an arm thrown around his body

اچانک کسی نے اس کے دوش پر ہاتھ رکھا۔

Yes my dear boy, replied the oldman, "it is indeed a bit of luck.

باپ: ہاں میرے عزیز! تمہاری امید سے بڑھ کر

بعض جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے چند الفاظ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کا مفہوم بالکل ہی بدل گیا ہے اور اس طرح جملہ اپنے معنی مکمل طور پر ادا کرنے پر قادر نہیں رہا۔

Neither Mercedes nor Edmond noticed this Evil Smile.

نہ مرسڈیز اور نہ ایڈمنڈ ہی اس کے چہرے کی عجیب صورت کو تمیز کر سکتے تھے۔

Evil Smile کا ترجمہ ''چہرے کی عجیب صورت'' کیا گیا ہے۔ جو موقع کی مناسبت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے لیے کوئی ایسا لفظ مخصوص ہونا چاہیے تھا جو ڈینگلرس کے کردار کو زیادہ واضح کر سکتا۔ اگر ''شیطانی مسکراہٹ'' کہا جاتا تو اس سے ڈینگلرس کے ارادے اور کردار قاری پر زیادہ کھل کر سامنے آسکتے تھے۔

چند مقامات ایسے بھی ہیں جن میں صرف ایک لفظ کی تبدیلی کی گئی ہے لیکن وہ تبدیلی موقع محل کے مطابق نہیں ہے۔ اس سے واقعات کے حقائق میں خلل پڑتا ہے۔ ڈینٹز کو جب قید کیا جاتا ہے تو وہ گورنر سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تا کہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکے لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ محافظ سے کہتا ہے

i will smash your head with this Stool.

اس پستول سے میں تمہارا بھیجا نکال دوں گا۔

Stool کا ترجمہ پستول کیا گیا ہے جو معنی کے اعتبار سے بھی درست نہیں ہے اور موقع محل کے لحاظ سے بھی۔ کیونکہ قید خانے میں بھلا اس کے پاس پستول کہاں؟ اور اگر اس کو صرف

دھمکی سمجھا جائے تو چند جملوں کے بعد ایک اور جملہ ہے جس میں سٹول کی جگہ پستول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

Dantes whirled the stool round his head.

ڈینٹز نے پستول اٹھا کر گھمایا۔

اسی طرح ایک لفظ کی تبدیلی سے مفہوم میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ذیل میں ہم ایک اور مثال دیکھتے ہیں:

One means by which you may a second time save me, if the Seesaw of Politics should one day place you high and me low.

یہ ایک اور ذریعہ ہوگا جس سے تم دوسری دفعہ مجھے بچاؤ گے۔ اگر کسی دن پولٹیکل ترازو کا پلہ تمہاری طرف بھاری ہو جائے اور میری طرف ہلکا۔

Seesaw کا ترجمہ ترازو کیا گیا ہے جو کہ مفہوم کے اعتبار سے تو درست ہو سکتا ہے لیکن اس سے جملے کی ذو معنویت متاثر ہوئی ہے۔ پولٹیکل صورت حال کے لیے سی سا کا لفظ ہی بہتر، پر اثر اور لطیف تھا کیونکہ صورت حال سی سا کی طرح ہی ہوتی ہے جس میں ایک فریق بلندی پر ہوتا ہے تو دوسرے فریق کو نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی صورت حال جب تبدیل ہوتی ہے تو پوزیشنیں بدل جاتی ہیں۔ نیچے والا اوپر اور اوپر والا نیچے چلا جاتا ہے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ دو چار الفاظ کے معانی بدلنے سے کہانی کے تسلسل میں بھی فرق پڑا ہے۔ مثلاً ڈینگلرس اور فرنینڈ جب ڈینٹز کے خلاف منصوبہ بندی کرتے ہیں تو کیڈروس ڈینٹز کے بارے میں اس خدشے کا اظہار کرتا ہے اور انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

And when a man gets out, and his name is Edmond Dantes, he takes his revenge.

تو جب وہ آزاد ہوگا تو اس کا نام ایڈمنڈ ڈینٹز ہے۔ ذرا یاد رکھو۔

انتقام اور بدلہ لینے کے بجائے ''ذرا یاد رکھو'' کہہ دیا گیا ہے جبکہ ناول کی کہانی جس نکتے کے گرد گھومتی ہے وہ دراصل انتقام ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مترجم کا اس سے مقصد یہ ہو کہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئی نہ کی جائے۔ ناول کی ابتدا سے سازش کے واقعات تک ڈینٹز ایک متحمل و سادہ مزاج اور معاف کر دینے والا جوان دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس موقع پر اس کے بدلے کے خدشے کو ظاہر کیا جاتا تو قارئین کو آئندہ واقعات کی جھلک دکھائی دے جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

ناول کے آغاز میں ایک اور اہم تبدیلی سال کی ہے۔ انگریزی ناول میں سال 1815ء کا درج کیا گیا ہے جبکہ اردو میں فصیح نے اسے 1810ء کر دیا ہے۔

اختصار:

ناول کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے بہت سے نکات حذف کر دیے ہیں۔ جن میں کچھ کے مختصر کر دینے سے تو تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن کچھ نکات ایسے بھی ہیں جو مفہوم میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرکزی کردار ایڈمنڈ ڈینٹز کی شکل وصورت انگریزی ناول میں بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اس کا حلیہ اور شکل اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ کہانے کے مختلف واقعات میں جب وہ بدلے ہوئے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کے حلیے ہی کی مدد سے اس کی شناخت کرتے ہیں کہ یہ ایڈمنڈ ہی ہوگا جو اس بھیس میں ہے۔ فصیح نے اس حلیے کے بیان میں زیادہ وضاحت کے بجائے بہت سی تفصیلات کو مختصر کر دیا ہے۔ انگریزی میں اس کا حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے:

"He was a young fellow of eighteen or twent, tall and slim, with black eyes, and hair dark as abnoy, and his whole appearance be spoke the calmness from childhood to contend with danger."

اسی طرح جہاز ''فرعون'' کا کپتان جس کی بیماری اور پھر وفات کا تذکرہ ڈینٹز نے ایم۔ مارل سے کیا اس کا نام درج کرنے کے بجائے اسے صرف کپتان کہہ کر پکارنے پر اکتفا

کیا گیا ہے جبکہ انگریزی ناول میں اس کا نام Leclere تحریر کیا گیا ہے۔

اختصار کی ایک اور مثال مرسڈیز اور ڈینٹز کی شادی کی ضیافت کے کھانوں کی ہے۔ان کھانوں کی تفصیل غیر ضروری سمجھی گئی ہے اور محض لذیذ چٹنیاں، اور بڑے لطیف کھانے کہہ کر مقصد پورا کرلیا گیا ہے۔

ڈینٹز کی شکل صورت کی طرح ولفورٹ کے خط و خال کو بھی وضاحت سے بیان نہیں کیا گیا۔

مرسڈیز اور فرنینڈ کی آپس کی گفتگو جو مکالماتی اور بیانیہ تھی اس کو بھی مختصر کر دیا ہے۔اسی طرح کیفیات کے بیان میں بھی اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ڈینٹز کو ابی فیریا کے بارے میں اس طرح بتایا جاتا ہے

Yes, mad: that's how madness always begins; we have a case here; it was through continually offering a million francs to the governor for his liberty that the abbe who had this chamber before you went off his head.

ہاں! ابھی ایک واقعہ ہوگزرا ہے ایک امیر کروڑ روپیہ گورنر کو دیکھنے کے واسطے دینے کا وعدہ کرتا ہوا پاگل ہوگیا تھا۔اسی کمرہ میں وہ تمہارے پیشتر تھا۔

وضاحت:

اختصار کے وصف کے ساتھ ساتھ کچھ مقامات پر مترجم نے بات، موقع اور کردار کی وضاحت کے لیے کچھ اضافے متن سے قطع نظر بھی کیے ہیں۔ان کا مقصد وضاحت کرنا بھی ہے اور مترجم کی ذاتی رائے پیش کرنا بھی۔مثلاً قلعہ ڈی ایف میں قید ڈینٹز انتہائی مایوسی کے عالم میں ایک دوسرے قیدی ابی فیریا کی آواز سنتا ہے۔وہ ایک عالم اور تجربہ کار شخص تھا۔ایک موقع پر ابی فیریا سورج کی کرن کے ذریعے اوقات کے تعین کو بیان کرتا ہے۔ڈینٹز ان معلومات پر ششدر رہ جاتا ہے۔ترجمے کے مطابق سطور درج کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

''اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ سورج مشرق سے چڑھتا اور بحر روم میں جا غروب ہوتا ہے اور وہ حرکت کرتا ہے۔ زمین حرکت نہیں کرتی۔''

اس ترجمے کے بعد درج ذیل چند جملوں کا اضافہ مترجم نے کیا ہے

''اس کرہ کی دگنی حرکت جس میں وہ بود و باش رکھتا تھا اور جو اسے بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسے بالکل غیر ممکن معلوم ہوتا تھا لیکن چونکہ ابھی تک اس نے اپنے ساتھی کے اشارات کے معانی نہیں سمجھے تھے اس لیے جو کچھ اس کے لبوں سے نکلتا تھا، علم کے عجائبات سے اسے معمور پاتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان عجائبات کا ایسے طور سے ظہور ہو جیسے کہ گجرات اور گولکنڈہ کے سفر میں اس نے لعل و زمرد درخشاں دیکھے تھے۔''

درج بالا جملوں سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایڈمنڈ ابی فیریا کے علم سے متاثر تھا اور ان علوم کو سیکھنے کا شائق تھا۔ دوسرا یہ کہ علم کے عجائبات کو گجرات اور گولکنڈہ کے درخشاں زمرد و لعل کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور پھر یہ بیان کہ اس نے گجرات اور گولکنڈہ کے سفر کے دوران لعل و زمرد دیکھے تھے۔ ان دو علاقوں کا تعلق مترجم کی سرزمین سے تو ہو سکتا ہے، مارسلیز سے نہیں۔

اضافے کی ایک اور مثال مترجم کے مدلل اور منطقی ذہن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فیریا کے مرنے کے بعد گورنر ڈاکٹر اور چند افسروں کے ہمراہ فیریا کی کوٹھڑی میں اس کی موت کی تصدیق کرنے آتا ہے۔ ڈاکٹر اسے چیک کرتا ہے اور اس کے مرنے کی تصدیق کر دیتا ہے۔ لیکن گورنر اسے دوبارہ چیک کرنے کے لیے کہتا ہے۔ ان سطور کا ترجمہ یہ ہے

''گورنر (اصرار کرتے ہوئے) صاحب تم جانتے ہو کہ ایسی صورتوں میں جیسے کہ یہ ہے ہمیں ہاتھ لگا کر دیکھنے سے یقین نہیں کرنا چاہیے اس لیے تمہیں چاہیے کہ جو باتین قانون کے رو سے نعش دیکھنے کے لیے مقرر ہیں اونکے موافق عمل درآمد کرو۔''

اس مکالمے کے بعد انگریزی متن کے مطابق اگلی سطور یہ ہیں:

"There was a moment of complete silence, during which Dantes, still listening, guessed that the doctor was examining and

sounding the corpse a second time."

لیکن اردو ترجمے میں اس صورت حال کو بدل دیا گیا ہے اور معائنے کے بجائے درج ذیل جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے:

ڈاکٹر: اچھا لوہا گرم کیا جاوے لیکن فی الحقیقت یہ احتیاط بے فائدہ ہے۔ اس حکم سے کہ لوہا گرم کیا جاوے، ڈینٹز کانپ گیا۔ اس نے جلدی جلدی قدموں کی آہٹ سنی۔ دروازے کی آواز بھی اس کے کانوں میں آتی۔ لوگ اندر باہر آتے جاتے تھے اور کچھ منٹ کے بعد ایک آدمی یہ کہتا ہوا آیا، یہ لو گرم شدہ سیخ آ گئی۔ پھر خاموش ہوئے، پھر جلتے ہوئے گوشت کی آواز سنائی دی اور اس کی مکروہ بدبو سے جہاں ڈینٹز چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہاں تک جا پہونچی۔ اس انسانی گوشت کے جلنے کی بو سے اس نوجوان کا چہرہ عرق آلود ہو گیا اور اس نے معلوم کیا کہ گویا اسے غش آ جائے گا۔

ڈاکٹر: صاحب آپ دیکھیں۔ وہ فی الحقیقت مر گیا ہے۔ ایڑی کو گرم شدہ سیخ کے ساتھ دیکھنے سے کوئی شبہ نہیں رہا۔ بچارہ بے وقوف اپنی بے وقوفی سے آزاد ہو گیا اور قید سے رہائی پا گیا۔"

غلام قادر فصیح نے ترجمہ کرتے ہوئے ان مقامات پر اضافے کیے ہیں جہاں انہیں حکمرانی و بادشاہت پر طنز کرنا مقصود تھا۔ یا پھر کوئی کردار کسی ناانصافی کا شکار ہوتا ہے تو ترجمے میں وہ اپنے خیالات کو بھی شامل کر دیتے ہیں کہ وہ ناول ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم اس واقعے سے لے سکتے ہیں جب انسپکٹر قلعہ ایف میں قیدیوں کے معائنے کے لیے آتا ہے اور ایڈمنڈ اور فیریا سے خصوصی طور پر ملتا ہے۔ وہ ان دونوں کی باتوں پر ہمدردانہ غور کرنے کے بجائے انہیں پاگل اور مجرم قرار دیتا ہے۔ جب وہ قید خانے سے باہر آتا ہے تو اس موقعہ پر فصیح نے درج ذیل سطور کا اضافہ کیا ہے جو ان کی ذاتی رائے بھی ہے اور اس ناول کا ایک اہم حصہ بھی۔

"کیلی گلایا نیرو۔ وہ خزانے کی تلاش کرنے والے، وہ ناممکن باتوں کے طلب کرنے والے اُس بے چارے کم بخت کی باتوں کو مان لیتے اور اس کی دولت کے عوض میں اسے وہ آزادی جس کا ایسی عاجزی اور منت سے طلب گار تھا، اسے عنایت کرتے لیکن زمانہ حال کے بادشاہ اغلبیت کی حدود میں پھنس کر نہ جرأت رکھتے ہیں اور نہ انہیں کوئی خواہش ہی ہوتی ہے۔ وہ ان

کانوں سے ڈرتے ہیں جوان کے احکام سنتے ہیں اور اس آنکھ سے خوف کھاتے ہیں جوان کے کاموں کو بدیدہ تعمق دیکھتے ہیں۔ سابق میں ان کا خیال تھا کہ مشتری سے ان کی پیدائش ہے اور وہی ان کا محافظ ہے لیکن آج کل ان کی سختی اور درشتی کی کوئی پایاں نہیں۔

ظالم سلطنتوں کی بحث سے یہ حکمت عملی ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کو کبھی پھر نمودار ہونے نہیں دیتے جیسے ان کو زشن (رومن کیتھولک پادریوں کی مذہبی عدالت) اپنے مخالفوں کو آزاد ہونے نہیں دیتی ویسے ہی دیوانگی قید خانوں میں پوشیدہ ہو رہتی ہے۔ اگر وہ وہاں سے روانہ ہو تو کسی تاریک ہسپتال میں جا بسیرا کرتے ہیں جہاں ڈاکٹر نہ زخمی آدمی کو نہ دل کو پہچانتا ہے جسے داروغہ جیل اس کے سپرد کرتا ہے ایبی فیریا کی دیوانگی کا بھی یہی باعث تھا اور ہمیشہ کے لیے اسے فتویٰ قید رہنے کا لگ چکا تھا۔''

ولفورٹ کے احساس ندامت اور شرمندگی کو واضح کرنے کے لیے نویں باب میں چند سطور کا اضافہ کیا گیا ہے:

''جب اس طور سے اس نے غور و تفکر کیا تو اسے یہ تکلیف جس کا ابھی میں نے بیان کیا ہے محسوس ہوئی اس نے ابھی تک کچھ خیال نہیں کیا تھا مگر اس وقت اس کے دل میں خفیف سی خفیف دہشت پیدا ہونے لگ گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ زخمی آدمی اس انگلی کی آمد سے جو اس کی طرف آتی ہے، کانپ جاتا ہے۔ جب تک وہ چنگا بھلا نہ ہو لیکن ولفورٹ کا زخم ایسا زخم تھا جس کی تکلیف کبھی تھمتی نہیں اور اگر ذرا تھم جائے تو پھر اور سختی کے ساتھ اس کا آغاز ہوتا ہے۔''

ناول کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں تبدیلیاں:

غلام قادر فصیح ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال ادیب تھے۔ ان کا اپنا ایک اسلامی پس منظر ہے۔ ان کے دادا ''ولی اللہ'' کے لقب سے مشہور تھے۔ والد عبداللہ کو قرآن فہمی کا شعور و ذوق تھا۔ فصیح کے حلقہ احباب میں ہر مکتبہ فکر اور مذہب کے لوگ تھے۔ اس کے باوجود جہاں کہیں رسوم و رواج کی بات آتی ہے وہ اس میں اسلامی رنگ ضرور شامل کر دیتے ہیں۔ ناول کے آغاز ہی میں ایم۔ مارل جب ایڈمنڈ کو کھانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ بڑی خوشدلی سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور مرسڈیز سے ملنا چاہتا ہے۔ ایم۔ مارل اس سے کہتا ہے

''اس سے مجھے کچھ تعجب نہیں ہوتا کیونکہ وہ میرے پاس آ کر تین دفعہ پوچھ چکی ہے کہ فرعون (جہاز) کی کوئی خبر ہے۔''

ان جملوں کے بعد چند جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ انگریزی متن میں نہیں ہے۔ یہ اضافہ خاصا معنی خیز ہے۔

''ایڈمنڈ تمہاری معشوقہ بڑی خوبصورت ہے۔

ڈینٹز سنجیدگی سے: وہ میری معشوقہ نہیں وہ مجھ سے منسوب ہے۔

مارل ہنس کر: تو وہی بات ہوئی

ڈینٹز: صاحب ہم اسے ایک بات نہیں سمجھتے۔''

ان جملوں کے اضافے کے بعد تسلسل وہیں سے جوڑا گیا ہے جو کہ انگریزی متن میں شامل ہے۔

یورپی تہذیب اور مشرقی تہذیب میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ لیکن غلام قادر فصیح نے کہیں کہیں ان یورپی کرداروں کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق پیش کر دیا ہے۔ مثلاً فرننڈ اپنی چچازاد بہن کو شادی کی دعوت دیتا ہے، اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے تو ردعمل میں مرسڈیز کبھی تو اسے اپنا بھائی کہتی ہے اور کبھی دوست۔ اگرچہ بعد میں اس کی شادی فرننڈ سے ہو جاتی ہے لیکن شادی سے قبل وہ اسے اپنا بھائی ہی تصور کرتی ہے۔

کچھ معنی خیز جملوں کو سادہ جملوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ شادی کی ضیافت میں ایڈمنڈ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہے کہ وہ مجھے اس قدر عزت دی گئی ہے کہ میں اپنے تئیں اس کے شایاں نہیں سمجھتا۔ اس کے جواب میں کیڈروس مسکراتے ہوئے اس سے کہتا ہے

"Husband!not yet Captain, cried Caderouse smiling. Try to play the husband, and see how she'll take it."

کیڈروس (مسکرا کر) نہیں نہیں ابھی تمہیں وہ عزت حاصل نہیں ہوئی۔ مرسڈیز ابھی تمہاری جورو نہیں ہے۔ ذرا خاوندوں کی طرح اسے مخاطب تو کرو۔ دیکھو کیسی وہ تمہیں یاد دلاتی ہے کہ ابھی وہ عزت تمہیں حاصل نہیں ہوئی۔''

ناول کی درج بالا تمام خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بطور ترجمہ ہم اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی دیکھ سکتے ہیں۔ تلاش کرنے پر مزید خصوصیات بھی سامنے آسکتی ہیں۔ لیکن اصل بات اس کی خامیوں یا خوبیوں کی نہیں ہے بلکہ اردو ادب میں اس کے ترجمہ کی ہے۔ وہ دور جب اس ناول کا ترجمہ کیا گیا وہ ابھی ترجمہ نگاری کے حوالے سے اتنا مضبوط دور نہ تھا۔ ایسے دور میں ایک مشہور فرانسیسی ناول کا ترجمہ ادب میں اہم رتبہ کا حامل ہے۔ اس ترجمے کی زبان ادبی ہے اور اس میں ترجمے کے زیادہ تر اصول موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور سے تعلق رکھنے والے ادب دوستوں کے لیے ''موتیوں کا جزیرہ'' ایک اہم، مشہور اور قابل قدر ترجمہ ہے اور ترجمے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

باب سوم

حوالہ جات

۱۔ جیلانی کامران، ترجمے کی ضرورت مشمولہ ترجمہ۔ روایت اور فن مرتبہ نثار احمد قریشی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۲

۲۔ حاجی احمد فخری، دورِ تراجم مشمولہ ترجمہ۔ روایت اور فن، ص ۳۹، ۴۰

۳۔ محمد خاں اشرف، ڈاکٹر، ترجمہ اور افسانوی ادب مشمولہ تخلیق مکرر ۲۰۰۴ء، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی یونیورسٹی لاہور، ص ۲

۴۔ نثار احمد قریشی (مرتب)، ترجمہ روایت اور فن، ص ۳

کتابیات

۱۔ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات ورسائل ۱۹۴۷ء تک، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۲۔امداد صابری، تاریخ صحافت (جلد اول)، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۳ء

۳۔تاریخ صحافت (جلد دوم) ۱۹۶۱ء

۴۔تاریخ صحافت (جلد سوم) ۱۹۶۳ء

۵۔تاریخ صحافت (جلد چہارم)، ۱۹۷۴ء

۶۔تاریخ صحافت (جلد پنجم)

۷۔امداد صابری، روحِ صحافت، دہلی: مکتبہ شاہراہ اردو بازار، ۱۹۶۸ء

۸۔ایم۔یوسف قمر، چونسٹھ سالہ تاریخ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ، سیالکوٹ: شعبہ نشر واشاعت انجمن اسلامیہ (رجسٹرڈ) سیالکوٹ، ۱۹۶۶ء

۹۔رشید نیاز، تاریخ سیالکوٹ، سیالکوٹ: مکتبہ نیاز، ۱۹۵۸ء

۱۰۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، شمس العلماء مولوی سید میر حسن۔حیات وافکار، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۱ء

۱۱۔عبدالوحید، خواجہ، جائزہ زبان اردو (پنجاب) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء

۱۲۔عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد، روایاتِ اقبال، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۱۳۔عطاء اللہ، شیخ، اقبال نامہ حصہ دوم، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، ۱۹۵۱ء

۱۴۔فصیح، غلام قادر، برگنڈی کی شہزادی، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۴ء

۱۵۔ بشابر کھشا یعنی زہریلا درخت، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۴ء

۱۶۔ ہیبت ناک کارلس، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۱۷۔ دربار لندن کے اسرار، پہلا سلسلہ پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۳ء

۱۸۔ دربارلندن کے اسرار، پہلا سلسلہ دوسری جلد، سیالکوٹ، پنجاب پریس، ۱۸۹۳ء

۱۹۔ دربارلندن کے اسرار، پہلا سلسلہ تیسری جلد، سیالکوٹ، پنجاب پریس، ۱۸۹۳ء

۲۰۔ دربارلندن کے اسرار، پہلا سلسلہ چوتھی جلد، سیالکوٹ، پنجاب پریس، ۱۸۹۳ء

۲۱۔ دربارلندن کے اسرار، دوسرا سلسلہ پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۲۔ دربارلندن کے اسرار، دوسرا سلسلہ دوسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۳۔ دربارلندن کے اسرار، دوسرا سلسلہ تیسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۴۔ دربارلندن کے اسرار، دوسرا سلسلہ چوتھی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۵۔ دربارلندن کے اسرار، تیسرا سلسلہ پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۶۔ دربارلندن کے اسرار، تیسرا سلسلہ دوسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۲۷۔ دربارلندن کے اسرار، تیسرا سلسلہ تیسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۸ء

۲۸۔ دربارلندن کے اسرار، تیسرا سلسلہ چوتھی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۸ء

۲۹۔ موتیوں کا جزیرہ، پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۴ء

۳۰۔ موتیوں کا جزیرہ، دوسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۴ء

۳۱۔ دربار پیرس کے اسرار، پہلی جلد موسوم بہ ظریف چیکٹ، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۸ء

۳۲۔ دربار پیرس کے اسرار، دوسری جلد موسوم بہ پینتالیس شاہی محافظ، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۸ء

۳۳۔ دربار پیرس کے اسرار، تیسری جلد موسوم بہ تین بندوقچی، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۸ء

۳۴۔ شہر پیرس کے اسرار، پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۵ء

۳۵۔ شہر پیرس کے اسرار، دوسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۷ء

۳۶۔ ایڈورڈ گبن کی لائف اور اس کی تصانیف کا تذکرہ، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۸۹ء

۳۷۔ براؤن سٹیچو آرورجن کس، لاہور: سبحانی پریس، ۱۸۹۳ء

۳۸۔ عمر پاشا، دو جلدیں، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۳ء

۳۹۔ فسانہ عجیب الخلقت یا گلیور صاحب کی سیر، لاہور: سبحانی پریس، ۱۸۹۵ء

۴۰۔ دربار روس کے اسرار، پہلی جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۹۰۱ء

۴۱۔ دربار روس کے اسرار، دوسری جلد، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۹۰۶ء

۴۲۔ حالات چین مع تصاویر، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۹۰۴ء

۴۳۔ عجائبات امریکہ، سیالکوٹ: پنجاب پریس

۴۴۔ تسخیر القمر، سیالکوٹ: پنجاب پریس

۴۵۔ پہلا پارہ، اردو، فارسی اور انگریزی ترجمہ، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۹ء

۴۶۔ پنج گنج الٰہی، سیالکوٹ: پنجاب پریس،

۴۷۔ وطن پر قربانی یعنی ہالینڈ کی آزادی، سیالکوٹ: قومی پریس، ۱۹۰۸ء

۴۸۔ محب وطن سفری بیوی، امرتسر: روز بازار سٹیم پریس، ۱۹۱۲ء

۴۹۔ ظالمانہ حکومت کا خاتمہ یعنی زاریت کا زوال، سیالکوٹ: قومی پریس، ۱۹۰۸ء

۵۰۔ میری بیماری کا تحفہ یعنی یورپین تہذیب کی درگت، سیالکوٹ: قومی پریس، ۱۹۰۸ء

۵۱۔ ہندوستان کی کہانی انگریزوں کی زبانی یعنی ہندوستان میں بدامنی کے اسباب، سیالکوٹ: قومی پریس، ۱۹۰۸ء

۵۲۔ خوشحال ہندوستان، سیالکوٹ: مفید عام پریس، ۱۹۰۷ء

۵۳۔ جنٹل مین چور، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۹۰۶ء

۵۴۔ خونی وزیر، امرتسر: روز بازار سٹیم پریس، ۱۹۱۳ء

۵۵۔ حب الوطنی کی عجیب مثال، سیالکوٹ: قومی پریس، ۱۹۰۸ء

۵۶۔ فرضی بی بی و میاں بی بی کا ڈراما، امرتسر: روز بازار سٹیم پریس، ۱۹۱۳ء

۵۷۔ حمائل شریف مترجم، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۸۹۴ء

۵۸۔ حمائل شریف مترجم، پاکٹ ایڈیشن، سیالکوٹ: پنجاب پریس، ۱۹۰۴ء

۵۹۔ تاریخ اسلام۔ عرب کا جغرافیہ، امرتسر: روز بازار سٹیم پریس، ۱۹۱۴ء

۶۰۔ سری رام کرشن پرمہنس اور ہندوستان کی بیداری، لاہور: ہندوستان سٹیم پریس، ۱۹۰۹ء

۶۱۔ ذخیرہ فیروزی، سیالکوٹ، پنجاب پریس

۶۲۔ تاریخ اسلام، جلد اول، لاہور: شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ، ۱۹۴۶ء
۶۳۔ تاریخ اسلام، جلد دوم، لاہور: شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ، ۱۹۴۶ء
۶۴۔ تاریخ اسلام، جلد سوم، لاہور: شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ، ۱۹۴۶ء
۶۵۔ تاریخ اسلام، جلد چہارم، لاہور: شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ، ۱۹۴۶ء
۶۶۔ خاتون عثمان، سیالکوٹ:
۶۷۔ سلطان ٹیپو عرف شیر میسور، سیالکوٹ: مفید عام پریس، ۱۹۰۸ء
۶۸۔ محبوب عالم، مولوی، اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ، مقدمہ و حواشی طاہر مسعود، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء
۶۹۔ محمد عتیق صدیقی، صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۶۲ء
۷۰۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء
۷۱۔ نثار احمد قریشی (مرتب)، ترجمہ۔ روایت اور فن، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
۷۲۔ نذیر نیازی، سید، دانائے راز، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۸ء

مقالہ جات

۱۔ غلام قادر فصیح، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، مقالہ نگار محمد صادق، نگران مقالہ ڈاکٹر وحید قریشی، مملوکہ اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۲ء (غیر مطبوعہ)
۲۔ مولانا ظفر اقبال۔ حیات و خدمات، مقالہ برائے ایم۔اے اسلامیات، مقالہ نگار عروبہ سعید قریشی، مملوکہ ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور، ۱۹۹۶ء، (غیر مطبوعہ)